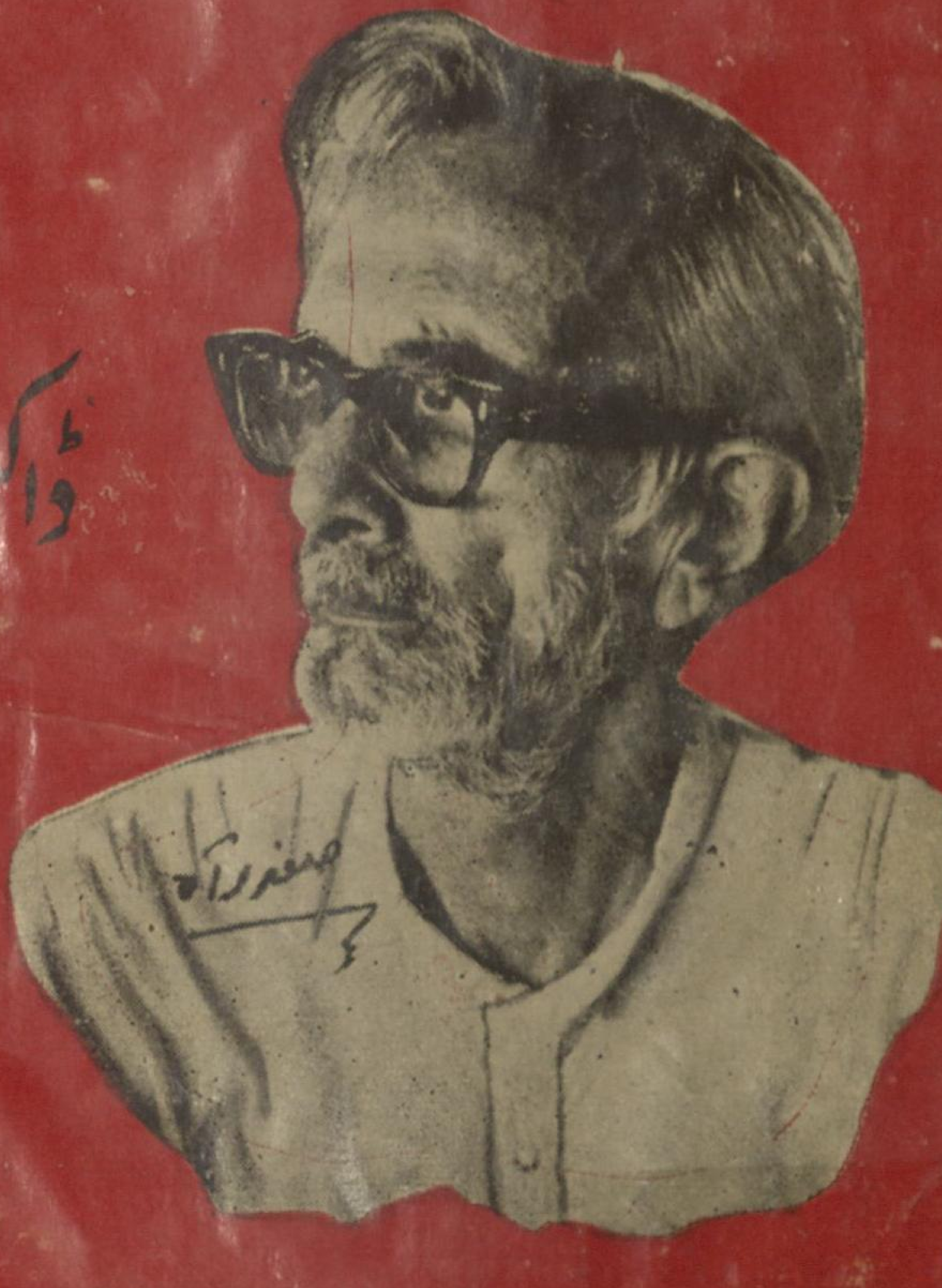
صفدر آہ بحیثیت شاعر



ڈاکٹر زرینہ ثانی
ایم-اے پی ایچ ڈی

مرا شعلۂ بغاوت ہے گراں بہا امانت
مرے بعد نوجوانو تم اسے جلائے رہنا (آہ)

صفدر آہ

(بحیثیت شاعر)

صفدر آہ کے چھ شعری مجموعوں کا جائزہ اور انتخاب

ڈاکٹر زرینہ ثانی
ام۔ اے، پی ایچ ڈی

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

مؤلفہ ——————— ڈاکٹر زرینہ ثانی
ایم۔اے (فارسی) ایم۔اے (اردو) پی۔ایچ۔ڈی

سالِ اشاعت ——————— ۱۹۷۹ء

قیمت ——————— ۱۶/- روپیہ

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اُردو (ہند)

اُردو گھر راؤز ایونیو

نئی دہلی (۱۱۰۰۰۲)

NAME OF THE BOOK — SAFDAR AAH BHAISYT SHAIR

SUBJECT — A CRITICAL SURVEY and selection OF SIX POETIC WORKS

PUBLISHED IN — 1979

PRICE — Rs 16

ADDRESS

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)

URDU GHAR, ROUSE AVENUE

NEW DELHI 110002

تعارف مؤلّفہ

میں اپنی شریکِ حیات ڈاکٹر ذرینہ ثانی کو Silver Fish یا کرم کتابی کہتا ہوں، کتابیں ہی اُن کا اوڑھنا ہیں، کتابیں ہی اُن کا بچھونا۔ مگر پڑھنے لکھنے کے انتہائی شوق کے باوجود وہ میرا اور بچوں کا کھانا ہمیشہ اپنے ہاتھ سے تیار کرتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ باورچی خانے میں بھی اُن کے ہاتھ سے کتاب نہیں چھوٹتی۔

کھاتی کم ہیں کھلاتی زیادہ ہیں، گھر والوں کو، مہمانوں کو، اُن شاگردوں کو جو کبھی کبھی اُن سے پڑھنے کے لئے گھر آجاتے ہیں۔ دل بالکل سادہ اور بے تصنّع پایا ہے۔ مزاج میں جلد بازی اور سیمابیت حد کی ہے۔ کام کرنے کا انداز یہ ہے کہ لکھنے پر آجاتی ہیں تو کاغذ سیاہ کر کے ڈھیر لگا دیتی ہیں، لیکن کام رُک گیا تو بس کاغذوں کا پلندہ باندھ کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اب تک اُن کی صرف دو کتابیں چھپی ہیں۔ اردو شاعری کی ہندوستانی رُوح اور سیمابؔ کی نظمیہ شاعری۔ لیکن ناتمام کتابیں نصف درجن سے زیادہ کاغذ کے پلندوں کی صورت میں رکھی ہیں۔

صفدر آہؔ سے بے حد متاثر ہیں۔ اپنی پہلی کتاب انھیں کے نام سے معنون کی تھی۔ اُن کی بڑی خواہش تھی کہ آہؔ پر ایک مستقل کتاب لکھیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اُن کی اِس کتاب سے اُن کی یہ دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔

اُن کا سنہ ولادت ہے ۱۹۳۶ء

وہ فارسی اور اُردو میں ڈبل ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں [illegible] ناگپور میں سینیئر لکچرر ہیں۔

عبدالحلیم ثانی

صفدر آہ کے شعری مجموعوں کی تفصیل

۱۹۳۶ء سے پہلے کا کلام:-

(۱) **آہ رسا**:- ردیف وار آہ کی ۳۰۸ غزلوں کا مجموعہ جس میں اُن کی ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک کی غزلیں ہیں۔ شاعر اپنے اس کلام کو رد شدہ اور مشقی کلام قرار دیتا ہے۔

(۲) **مختلفات**:- یہ ایک بیاض بھی جس میں کچھ اُردو فارسی کے قصیدے، کچھ نیچرل، قومی اور مذہبی نظمیں اور چند انگریزی، عربی اور فارسی نظموں کے منظوم ترجمے تھے۔ یہ بیاض کھو گئی ہے، شاعر کو اپنے قصائد ضائع ہو جانے کا اب تک افسوس ہے۔ یہ کلام کہیں کہیں پُرانے پرچوں میں نظر آجاتا ہے۔ اسے بھی آہ مجموعۂ منسوخ قرار دیتے ہیں۔

(۳) **آہ کے سو شعر**:- ۱۹۳۰ء میں پنڈت برج بہادر رام۔ اے نے آہ کی غزلوں کے سو شعر انتخاب کر کے ایک فاضلانہ مقدمے کے ساتھ شائع کئے تھے۔ ۱۹۳۶ء تک اس کتاب کے تین ایڈیشن نکلے۔ آخری ایڈیشن ڈی لکس اور مصوّر تھا، اس کتاب میں مولانا صفی، آغا شاعر، پروفیسر مسعود حسن ادیب، صفوی اور آثر لکھنوی وغیرہ کی رائیں خود انھی کے عکس تحریر میں شامل تھیں۔ آہ اپنے اس کلام کو بھی کلام منسوخ قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے ۱۹۳۶ء سے قبل کے تمام کلام کو مشقی اور مسترد بتاتے ہیں۔

۱۹۳۶ء کے بعد کا کلام:-

(۴) **زمزمہ**:- آہ کی رباعیوں کا ۱۹۶۳ء میں پہلا ایڈیشن شائع ہوا جو اپنے اعلیٰ معیار، ندرت اور تنوع کی وجہ سے ادبِ رباعی کے بہترین مجموعوں میں شمار کیا گیا۔ ان رباعیوں کا انتخاب اس مجموعے میں شامل ہے۔

(۵) **نقش**:- دوسرا مجموعۂ رباعیات جو ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔ اس کتاب میں اس کا انتخاب شامل ہے۔

(۶) **نو بہ نو**:- فلسفۂ انبساط پر آہ کی ایک انقلابی مثنوی جس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں نکلا، دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا، اس کتاب میں اس کا انتخاب شامل ہے۔

(۷) **گلبن**:- آہ کی نظموں کا مجموعہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں اس کا انتخاب شامل ہے۔

(۸) **ایک بیاض**:- ۱۹۵۹ء کے بعد کی نظمیں جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں۔ ان کا انتخاب اس مجموعے میں موجود ہے۔

(۹) **غزل پارے**:- فلمی غزلوں کے علاوہ جو ادبی غزلیں آہ نے ۱۹۳۶ء کے بعد کہی ہیں، ان کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے۔

نوٹ:- ان شعری مجموعوں کے علاوہ آہ کی ایک درجن بلند پایہ نثری تصنیفات بھی موجود ہیں۔

مشمولات

اس کتاب میں آہ کے حسب ذیل شعری مجموعوں کا انتخاب شامل ہے۔

یہاں مطبوعہ سے مراد وہ کلام ہے جو مجموعے کی صورت میں شائع ہو چکا ہے
غیر مطبوعہ سے مراد وہ کلام ہے جو ابھی بصورت مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے

عرضِ شاعر

طویل علالتوں کے ساتھ عمر پچھترویں منزل پر پہنچ چکی ہے۔ وقت میرے لئے میکدۂ شاعری سے بیروں رفتن کا حکم صادر کر چکا ہے، جسے شاد و ناشاد قبول کرنا پڑا ہے۔

اس وقت میرے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نو شعری مجموعے ہیں۔ جن میں سے ایک ضائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔ میں اس سے پہلے کا اپنا تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام قلم زد کرتا ہوں۔ یہ رد شدہ کلام خواہ کسی صنف کا ہو، میرا مشقی کلام سمجھا جائے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد کے میرے تمام مجموعوں کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے۔

اس انتخاب کو اِس صورت میں پیش کرنے کا خیال ڈاکٹر زرینہ ثانی کے ذہن کی برمحل اُپج ہے۔ میرے کلام کا محاسبہ بڑی سختی سے ضرور کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے مسرت ہے کہ فاضل مؤلفہ نے میرے چھ مجموعوں کی روح در روح اِس مختصر انتخاب کی صورت میں پیش کر دی ہے۔

میری نظر میں یہ انتخاب میرا بہترین شعری مجموعہ اور اپنے قارئین کے لئے میرا آخری منظوم تحفہ ہے ؎

افسوس اجل لے چلی مے خانے سے
بن جائیں گے کچھ روز میں افسانے سے
ہم رندِ بلانوش جو یاد آ جائیں
چھلکا دینا ذرا سی پیمانے سے

(آہ)

صفدر آہ

صفدر آہ

۱۹۰۵ء کے عالمگیر انقلابی سال میں آہ سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نامی قاضی سید محمد حیدر تھا۔ لیکن آہ مدتوں سے خود کو قاضی یا سید نہیں لکھتے۔ آہ کے نانا فردوسی ہند فارغ علیہ الرحمہ میر انیس کے اہم ترین شاگرد تھے۔

آہ کی تعلیم سیتاپور اور لکھنؤ میں ہوئی۔ وہ شعرائے لکھنؤ کی ینگ پارٹی کے سرگرم رکن تھے، انگریزی، فارسی اور عربی کے علاوہ ہندو علوم میں بھی ان کو مہارت حاصل ہے۔ تلسی داس، میرا اور کبیر کے عالمانہ جائزے اُردو کو انھیں نے دیئے ہیں۔ تلسی داس اور کبیر پر وہ عہد کے مستند ترین محققین میں شمار ہوتے ہیں۔

اُن کا کلام ۱۹۱۹ء سے رسائل میں چھپنے لگا تھا۔ ان کی پہلی تصنیف ۲۲ء میں شائع ہوئی جو سالِ اشاعت سے دو سال قبل لکھی گئی تھی۔ ۲۸ء سے اُردو میں ہفتہ وار "ہاتف" اور ۳۴ء سے ہندی میں "جنتا" نکالنا شروع کیا۔ جو کئی سال چلتے رہے۔

۳۸ء میں ڈاکٹر محبوب کی دعوت پر فلم میں آئے۔ ۲۳ سال تک فلم میں مصروف اور کامیاب زندگی گزاری۔ ۵۹ء میں ہارٹ اٹیک ہوا۔ ۶۱ء سے صحرا نشینی اختیار کی۔ فلم سے اب تعلق برائے نام ہے۔ زیادہ تر وقت علمی اور ادبی کاموں میں گزارتے ہیں۔ ایک مختصر سی لائبریری ان کے ساتھ ہے۔ اسی جنگل سے وہ کئی بلند پایہ نثر اور نظم کی تصانیف اُردو کو دے چکے ہیں، جو اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

زرینہ ثانی

آہ کی شاعری

محقق صفدر آہ سے مجھے شرف نیاز بہت بعد میں حاصل ہوا، لیکن باغی شاعر صفدر آہ کے باغیانہ فلمی گیت زمانۂ طالب علمی ہی سے میرے کانوں میں گونجتے رہے ہیں اور میرے ذہن میں اس انقلاب نواز شاعر کے سلگتے ہوئے دل کا ایک انوکھا امیج اُسی وقت سے بن گیا تھا۔ باشعور ہونے کے بعد جب میں نے آہ کی فلسفیانہ مثنوی، حکیمانہ رباعیات اور انقلابی نظموں کا مطالعہ کیا تو یہ امیج ایک قد آور سنگین بُت بن گیا۔

ایک قدامت پرست ماحول میں پرورش پانے کے باوجود آہ کی فطرت اور جبلت یک لخت باغی تھی۔ اپنی ایک نظم میں وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

ترے بہشت کو ٹھکرا کے میں نکل آیا
میں آدمی ہوں اطاعت نہیں ہے میری سرشت (رنگلین)

ان کی اس سرشت کو غیر متوقع حالات اور تجربات نے ایک شعلۂ جوالہ بنا دیا ہے۔ حیرت ہے کہ جس بچے کو تبلیغ دین کی تعلیم کے لئے خواجہ غلام الحسنین (خواجہ احمد عباس کے چچا) کا شاگرد بنایا گیا تھا اُس نے باہوش ہونے کے بعد دین سے بغاوت کر دی۔

آہ ایک فلسفی شاعر ہیں اُن کی بغاوت بھی فلسفیانہ اور فکری ہے۔ یاوہ گوئی اور دل آزاری نہیں بشعر و ادب کے معاملے میں وہ روایات کا بیجا احترام کرتے ہیں۔ فن اور زبان کی غلطیاں ان کی نظر میں ناقابل معافی ہیں۔ ہاں اجتہادات کا حق وہ ہر اہل ادیب اور شاعر کو دیتے ہیں۔

میری نظر میں آہ کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی بغاوت ہے۔ ان کی یہ بغاوت صرف سیاست تک محدود نہیں، وہ مذہب، معاشرہ، اعتقادات، انداز فکر، غرض ہر شعبۂ زندگی میں ایک بنیادی انقلاب (Radical Revolution) کے حامی ہیں۔ ان کے خیال میں یہ انقلاب ضرور آئے گا اور اس کے بعد ہی وہ انسانی ذہن پیدا ہوگا جو صدیوں کی حد بندیوں سے آزاد ہوگا اور جس میں ندرت، جودت اور تنوع کے ساتھ حیات کو بالکل اور بالمجموع سمجھنے کی صلاحیت ہوگی۔

اچھے شاعروں کا انفرادی طرزِ بیان ہوتا ہے، اسی طرح بیان کو ان کی شاعری کے خدوخال کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اسی کی بنا پر اُن کا کلام دوسرے شاعروں سے ممیّز رہتا ہے۔

آہ نے اپنی باغیانہ فکر کے اظہار کے لئے ایک بڑا پُر وقار اور پُر آہنگ لہجہ تراشا ہے، وہ اپنے علمی، فلسفیانہ اور تجریدی تخیل کے لئے ایک خاص قسم کی زبان پیدا کرتے ہیں جس میں بھرپور ابلاغ اور تجدّد ہوتا ہے۔ ذرا دیکھئے علمی اصطلاحات اور لغت پر انھیں کتنی ماہرانہ قدرت حاصل ہے۔

لائیت سے وجود کا ظہور ہونے والا ہے۔ اس ناقابلِ بیان حالت کا اظہار وہ کس عالمانہ انداز سے کرتے ہیں ؎

ناگہاں ایک جنبشِ مبہم ہوئی پیدا درونِ بحرِ قدم
پُر معانی ہوا رُخِ ایجاد رمز بننے لگا ازل کا سواد
خلوت آسا ہوا سکوتِ جمود تھرتھرانے لگے حروفِ نمود
صُوَرِ علمیہ نکھرنے لگیں یعنی ماہیتیں اُبھرنے لگیں
قلبِ "لا" میں "نعم" ہوئی جنبان آئینے میں ہنسیں کہ کوندی ہاں
تھا سنانے کو بر لبِ لاہوت ایک پُر کیف نغمۂ ناسوت

ایک اور جگہ "ازل الآزال" کا تصوّر سے بالاتر منظر دیکھئے ؎

ہوئے لاہو کا ایک عالم تھا لا وجود اک وجودِ مبہم تھا
بے نشاں تھے تعدّد و کثرت سو رہی تھی دوشیزۂ وحدت
تھا عدم میں قدم قدم میں عدم دونوں گویا بہم دگر مدغم (نوبہ نو)

اُردو میں یہ لب و لہجہ شاذ ہی مل سکے گا۔ واضح رہے کہ آہ تصوف یا ویدانت کے متبع نہیں ہیں۔ اُردو کی رعایت سے انھوں نے مصطلحاتِ تصوف صرف افہام اور ابلاغ کے لئے استعمال کئے ہیں۔

آہ کا طریقۂ فکر دوسرے مفکّرین سے الگ ہی نہیں بڑی حد تک اُن سے متضاد ہے۔ وہ کسی کی پیروی کے سخت مخالف ہیں۔

پیروی عقل کی ہے کوتاہی پیروی اصل وجہ گمراہی
کوئی مرشد بتا نہیں سکتا راستہ منزلِ حقیقت کا (نوبہ نو)

اسی قسم کی بات وہ ایک رباعی میں بھی کہتے ہیں ؎

اوتار، شیوخ، انبیا آتے ہیں جو خود نہیں جانتے وہ بتلاتے ہیں

پایانِ شبِ ظلم، کسی کو نہ ملا ۔۔۔ باتیں کر کے سحر کی سوجاتے ہیں (نقش)

مذہب کے لئے آہ کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی مذہب درست نہیں ہو سکتا۔ متحرک حیات لمحہ بہ لمحہ نئی ہوتی ہے جو ہزاروں سال پرانے کسی جامد نظام کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ حیات کے پاس خود اپنا راستہ ہے جو ہمہ فلاح، ہمہ راستی اور ہمہ محبت ہے، ساری زحمت اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ حافظے کا بنایا ہوا چالاک انسانی دماغ جو ہمہ شر، ہمہ فساد اور ہمہ خود پروری ہے اپنا راستہ حیات پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔

نظریۂ زماں کو تو آہ نے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ شاید ہی کوئی فلسفی اسے اس طرح پیش کر سکا ہو:۔

"ازل الآزال" کی کلیت محض میں "کن" کی روایتی گرج سے ایک جزویت کا ظہور ہوتا ہے اور ایک ذرّہ کل سے الگ ہو جاتا ہے۔ یہی علیحدگی وجود کے موجودہ تماشے کا سبب بنتی ہے۔ ؎

جزو کل میں خلا ہوا پیدا ۔۔۔ اور اصولاً محال تھا یہ خلا
پُر کیا ایک سیل "ل" نے اسے ۔۔۔ بھر دیا "خلط و اہما" نے اسے
اصل اس خلط کی سراب صفت ۔۔۔ پھر بھی ہستی میں اپنی اصلیت
بعد رابع کسی نے اس کو کہا ۔۔۔ اور کسی نے اسے کہا یا
میں سے کہتا ہوں زماں اے دل ۔۔۔ یعنی ماضی و حال و مستقبل
اسکو پہنچے نہ رَو تصوّر کی ۔۔۔ یہی علّت ہے ہر تغیّر کی (دلوبرنی)

وقت کے لئے "خلط و اہمہ" کا تصوّر کتنا لطیف اور نیا ہے۔ وقت کو ویدانت میں مِتھیا سمجھا جاتا ہے، لیکن "خلط و اہمہ" اس سے کہیں زیادہ معنی خیز اصطلاح ہوگی۔

وجودِ خدا پر آہ کا نقطۂ نظر مبہوت کن ہے۔ ہمارے بڑے بڑے اہلِ دانش کا قول ہے کہ خدا کا سوال بحث و مباحثے سے طے نہیں ہو سکتا۔ آہ اس معاملے میں کہتے ہیں کہ خدا ہمارا وضع کیا ہوا ایک لفظ ہے اور ہر لغت میں موجود ہے۔ مفروضہ خدا کے لئے وہ کہتے ہیں ؎

ہے خدا کی یہ ہستیِ مبہم ۔۔۔ ظنِ انساں کا وضع کردہ صنم

اگر شاعر بات یہیں پر چھوڑ دیتا تو وہ ایک فتویٰ اور دعویٰ بن کر رہ جاتی۔ لیکن آہ اپنے دعوے پر ایسا بدیہی استدلال پیش کرتے ہیں جس پر ابھی تک کسی الٰہیاتی فلسفی کی نظر نہیں پہنچی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

ابنِ آدم کے تھے جو نفسیات ۔۔۔ ہم نے اسکو دیئے ہیں اپنے صفات

قہر ہم میں ہے اور وہ قہار — جبر ہم میں ہے اور وہ جبار
ہم میں حرصِ قیام وہ قائم — ہم میں طمعِ دوام وہ دائم
کبر ہم میں ہے کبریا وہ ہے — اک ہمارا اگڑھا خدا وہ ہے

وجودِ خدا سے نثر و نظم میں بہتوں نے اختلاف کیا ہے، لیکن یہ حقیقت پسندانہ استدلال اردو سے لیکر فارسی تک کہیں نہیں مل سکے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ موجودات کی علت بہر حال ہے، لیکن اسے ذہن کے تراشے ہوئے نام اور وصف نہیں دیئے جا سکتے۔ ان کے یہی مصنوعی نام اور وصف مفروضہ خدا بن گئے ہیں اور حقیقت غائب ہو گئی ہے۔

تناسخ کے مسئلے کو بھی آپ نے ایک بالکل اچھوتے زاویے سے دیکھا ہے، ہندوؤں کے تمام مذاہب اور شعبہ جات فلسفہ تناسخ کو بالاتفاق مانتے ہیں، لیکن آپ اسے انسان کی خواہش بقائے دوام (Continuity) کا ایک کرشمہ سمجھتے ہیں۔ آدمی اس بات کو قبول کرنے سے خوف کھاتا ہے کہ وہ فنا ہو جائے گا۔ اسی ڈر سے بچنے کے لئے اس نے مفروضہ روح یا آتما کی تخلیق کی ہے اور اسے ابدیت کا وصف بھی دے دیا ہے۔ یہ روح جسے ذہنِ انسانی اپنی ذات قرار دیتا ہے ہندو فلسفیوں کے نزدیک جسم بہ جسم سفر کرتی ہوئی ابدیتِ مطلق کی طرف بڑھ رہی ہے۔ آپ اس جسم بہ جسم سفر کو غیر حقیقی قرار دیتے ہیں، وہ موت اور تولید کو غیر حقیقی زماں کی شعبدہ بازی بتاتے ہیں۔

بالتواتر ہے مرگ لاحاصل — سیر ماضی و حال و مستقبل
یہ زماں کی ہے شعبدہ بازی — مرنا جینا ہے جھلکیاں اس کی
بیم و امید کا تماشا ہے — وقت مرتا ہے وقت جیتا ہے
موت ماضی نامکمل ہے — حال کیا ہے حیات مختل ہے
حال کی تشنگی سے ہے فردا — حال کامل ہوا تو باقی کیا
اک مسلسل حیات حال ہی حال — جس کا ماضی نہ کوئی استقبال

اور

واہمہ میں ہے جشنِ موت و حیات — غیر فانی ہے نفسِ شے بالذات

یعنی شاعر کے خیال میں موت و حیات کا مصنوعی کرشمہ صرف حدودِ زماں تک ہے۔ نفسِ شے ہی اصل شے ہے جو ازلی، ابدی، "حیّ و قیّوم" ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ جس چیز کو ہم موت کہتے ہیں وہ ہے کیا؟ موت کے معنی یہی سمجھے جاتے ہیں کہ "میں مر جاؤں گا" یہ "میں" کیا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اپنی نسلی وراثت

اکتساب کی ہوئی شہرت، قابلیت اور دولت، خود اپنی پیدا کی ہوئی جذباتی رغبت، نفرت اور محبت، تجربات اور ان کے تابع احساسات اور ایسی ہی بہت سی چیزوں کے مجموعے کا نام "میں" ہے جو فی الحقیقت ماضی ہے اور حافظے میں بھرا ہوا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ "میں" حافظہ ہے۔ موت اسی "میں" کو ختم کر دیگی۔ یہی میں اور اس کے متعلقات ہمارا وجود ہیں اور ہم اپنے وجود کے اختتام سے ڈرتے ہیں۔ مقصودِ زندگی تو یہ تھا کہ ہم ساٹھ ستّر سال زندہ رہکر اچھے برے تجربات اکٹھا کریں اور انھیں اجتماعی انسانی شعور کو سونپ دیں۔ اسی طریقۂ کار سے انسانیت وحشی ایپ مین (Apeman) سے لیکر عقلِ اعظم آئنسٹائن تک کا سفر کر سکی ہے۔ انسانوں کے اس اجتماعی شعور collective (consciousness) میں مشترک انسانی جبلّت ہے۔

غرض حافظہ مرتا تو ہے لیکن پھر سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ فرد کا وجود بحر کی سطح کا ایک حباب ہے جو پھوٹ کر پانی میں مل جاتا ہے۔ حباب اس اعتبار سے تو موجود ہے کہ وہ اپنی محلول شکل میں بحر میں ہے لیکن اس کے لیے سابقہ وجود اختیار کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ ہندو فلسفیوں کی گہری نظر نے جس چیز کو مرتے اور پیدا ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ "زماں" ہے۔ زماں کی "خلط دائمہ" ماضی کی پیداوار ہے، ماضی اسی خلط کے ذریعے حال اور مستقبل میں داخل ہوتا ہے۔

اسی طرح تقدیر کا سوال بھی سائنسی مفکروں اور توہم پرستوں کے درمیان موضوعِ مباحثہ بنا رہتا ہے۔ آہ اس مسئلے کو کتنی معقولیت سے حل کرتے ہیں ؎

کثرتِ ماضی ہیں حال و مستقبل — ماسبق سلسلوں کے ہم حاصل
جسدِ آباد و موروثِ اعلیٰ — غار کی زندگی ہے تا ایں جا
فکر و طرزِ معاشرت، مذہب — قوم و آب و ہوا غرض یہ سب
حال و فردا کی کرتے ہیں تعمیر — شاید اس کا ہی نام ہو تقدیر

یعنی توقعات کوئی اتفاقی چیز نہیں۔ یہ اسباب علل کے ایک طویل سلسلے کا نتیجہ ہیں جن کا پیش آنا لازمی ہے۔ یہی تقدیر ہے۔

خیر و شر کو بھی آہ بے اصل سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسیرِ ورثہ جات ذہن نے اپنے روایتی طریقۂ فکر کے مطابق کچھ معیار بنا لیے ہیں۔ جن پر نام نہاد خیر و شر کا دار و مدار ہے ؎

ذہن خود ہے اسیرِ ورثہ جات — جس کے ناقص تعیّنات صفات
خیر اور شر میں فاصلہ کیا ہے — نام کے فرق کے سوا کیا ہے
آتشیں مہر اور خنک مہتاب — گرمیاں اور لکہ ہائے سحاب
نالۂ عندلیب خندۂ گل — سوزِ نغمات سازِ قلقلِ مُل

عیب کون انمیں اور ہنر ہے کون   خیر کون ان میں اور شر ہے کون

روٹی کا سوال بڑا اہم ہے جسے فوراً حل ہونا چاہئے۔ لیکن نفسیات (Psyche) کے مسائل بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں جو انسانی زندگی کو روندے ڈالتے ہیں۔ آہ نے انسان کی خوف زدہ اور تھکی ہوئی نفسیاتی زندگی کی کتنی بھرپور تصویر کھینچی ہے ؎

حافظے کی یہ بالتواتر زد   اور یہ خواہشات کی یگ ودو
اُفقِ ذہن کی یہ بوجھل شام   اور تصور تھکا تھکا ناکام
کھوئے کھوئے ہوئے بجز مفقود   سہمے سہمے ہوئے تمام وجود
زیرِ لب ورد ہے یہی ہر بار   "وقنا ربنا عذاب النار"
مذہبوں کے بڑے بڑے گٹھڑ   بے محابا لدے ہوئے سر پر

Psyche کے ان شدائد کے نیچے دبا ہوا خوف زدہ تھکا ماندہ انسان ایک لایعنی زندگی گزار رہا ہے اور مفر کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

آہ نے نفس کو بھی بڑے حقیقت پسندانہ زاویے سے دیکھا ہے۔ ان کے نزدیک زاہد شب زندہ دار اور رند بادہ گسار دونوں عمل نفس کی دو شکلیں ہیں۔

نفس کی ہے یہ خوئے ناہنجار   کرتا ہے یہ حقیقتوں سے فرار
حدّت بہت سہہ نہیں سکتا   حال کے ساتھ رہ نہیں سکتا
کبھی چھپتا ہے عیش و عشرت میں   کبھی ہوتا ہے گم ریاضت میں
کبھی مسجد میں میکدے میں کبھی   بن کے صوفی مراقبے میں کبھی
کبھی رنگیں خرام عشقِ صنم   کبھی حجرہ نشیں حبسِ دم

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان خشک فلسفیانہ مسائل کو آہ نے کتنے حسین شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے جس سے ان کی مشاقی اور قوتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ آہ کے متعلق کسی نے لکھا تھا کہ ایام مشق میں ان کے استاد محترم نظم مرحوم حکم دے کر ان سے روزانہ ایک غزل کہلاتے تھے۔ اس غزل کی وہ خوب تعریفیں کرتے تھے، اس پر اصلاح دیتے، بقدر آنے جانے والوں کو سنواتے تھے۔ آخر میں کہتے تھے کہ میرے گھر کے کھاری کنوئیں میں یہ کاغذ ڈال دو تاکہ اس کا پانی میٹھا ہو جائے۔ یہ عمل روز جاری رہتا تھا۔ ظاہر ہے کنوئیں کا پانی تو کیا میٹھا ہوتا، لیکن صاحب نظر استاد نے اپنے حسنِ تدبیر سے ایک قادر الکلام شاعر ضرور اردو کو دیدیا۔

آہ نے مجھے لکھا تھا "بڑی دشواری یہ ہے کہ ہم تجدّد اور انقلاب کی باتیں تو کرتے ہیں۔ لیکن مانتے وہی باتیں ہیں جس میں ہمارے سڑے گلے معتقدات کی تائید (Conformity) ہو۔ اپنے

مفروضات کے خلاف کوئی بات قبول کرنا آسان نہیں ہوتا۔

تقریباً ۳۷ـ۱۹۳۸ء میں ڈائرکٹر محبوب کی دعوت پر آہ فلم میں آگئے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں کسی کو یہ سمجھانا سخت مشکل ہے کہ اُس زمانے میں فلم کا ماحول کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھئے کہ اس وقت ملک میں آزادی کے لئے زبردست پنجہ کشی ہو رہی تھی۔ ایسے نازک وقت پر آہ نے جو انقلابی خیالات فلم کو دیئے وہ بڑی جرأت کا کام تھا۔ آہ پہلے ترقی پسند ادیب ہیں جو فلم میں آئے اور ہندوستان کے کروڑوں فلم بیں عوام تک انقلاب کا پیغام پہنچایا۔

۱۹۴۲ء کے ہنگامہ خیز سال میں آہ نے محبوب کی فلم روٹی کے گانوں میں یہ انقلابی پیغام دیا تھا۔

دکھیا دُربل دین ہے روٹی ہاتھ مروڑ کر چھین لے روٹی

بھیک مانگ کے جینے سے تو اچھا ہے مرجانا

روٹی فلم سنسر ہوئی اور سارے ملک میں طوفان بن کر چلی۔ جب یہ فلم یوپی پہنچی تو ارباب حکومت کو خیال آیا کہ اس میں تو تشدد کی کھلی ہوئی دعوت دی گئی ہے۔ غرض کہ اس فلم کو یوپی میں ممنوع قرار دیا گیا۔

اسی فلم روٹی میں ایک پاگل فلسفی کا عجیب سا کردار تھا۔ ذرا اس کا گانا ملاحظہ ہو۔ انوکھے کرداروں کے گانے لکھنا آہ کا حصہ تھا۔

روٹی ! روٹی ! روٹی !
کیوں رٹنا روٹی روٹی
بھوک لگی ہے ؟ بھوک لگی ہے ؟
آگ کھا، انگارے کھا بھوکے گگن کے تارے کھا
ہمت تیری بھوٹ ... روٹی، روٹی، روٹی
مرجائے گا ؟ مرجائے گا ؟ مرجا، مرجا، مرجا
بوجھ زمیں کا ہلکا کر جا
جیون پونجی کھوٹی ... روٹی، روٹی، روٹی

اس گرجتی ہوئی بے بر یہ دہکتے ہوئے الفاظ بٹھا دینا آہ ہی کا کام تھا۔ واضح رہے کہ کردار اور سچویشن کے مطابق آہ خود بے بر پیدا کرتے تھے۔ آجکل کی طرح کسی مقبول بے بر وہ الفاظ کبھی نہیں چپکاتے تھے۔

آہ بھجن میں بھی اپنی سرشتِ بغاوت کو نہیں بھولتے تھے

رام رام کیا جپنا بندے کرلے کام تو اپنا
رام رام کیا جپنا
کرم دھرم ہے، دھرم کرم ہے اگر کرم نہیں تو دھرم نہیں

مفت خور کہلائے جگ میں سادھو تجھ کو شرم نہیں
بڑی تپسیا محنت کرنا، کڑی دھوپ میں تپنا
رام رام کیا جپنا

ایک نوجوان جھاڑو والی کا گیت :-

پیٹ بھوکا جوانی ستائے رام

جذباتی گیت بھی آہ نے بے مثل لکھے ہیں۔ تلاشِ روزگار میں دن بھر تھک کر ایک ناکام نوجوان شام کو گھر واپس جا رہا ہے ؂

سانجھ بھئی بنجارے، سانجھ بھئی بنجارے
ڈگر ڈگر کی دھول اڑائی من کی آس نہ پائی
پھر لگا کب تک مارا مارا جا جا اب گھر جا رے
سانجھ بھئی بنجارے

ملتی ہیں اب دنوں سے راجیریاں نیت بسیرا
زرا دیر میں دیئے جلائے آتے ہوں گے تارے

جا جا اب گھر جا رے
سانجھ بھئی بنجارے

سُنا گیا ہے کہ یہ گیت بابو پرشوتم داس ٹنڈن کو بہت پسند تھا۔ (واللہ اعلم)
مکیش کی گائی ہوئی آہ کی غزل ؂

دل جلتا ہے تو جلنے دے آنسو نہ بہا فریاد نہ کر

شاید فلم کا مقبول ترین گانا ہے، اچھے گیت چار چھ سال بج کر گیتوں کے البم میں چلے جاتے ہیں، لیکن یہ غزل ۳۴ سال سے قریب قریب ہر ہفتے کسی نہ کسی ریڈیو اسٹیشن سے ضرور آتی ہے۔ مکیش کے پلے بیک کیریر کی ابتدا اسی گانے سے ہوئی تھی۔

سوائے دو چار مستثنیات کے آہ کے گانوں کی تمام طرزیں انل بسواس میوزک ڈائرکٹر نے بنائی ہیں۔ آہ انل بسواس کے بے حد مداح ہیں۔

آہ کے شباب کی غزلیں مغنیوں نے گلی گلی میں پہنچا دیں۔ ان کا فلمی کلام سارے ہندوستان میں گایا گیا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کی ۱۹۳۶ء کے بعد کی ادبی غزلوں میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر مقصدیت اور علمیت زیادہ اور غنائیت کم ہو گئی۔ پھر یہ غزلیں اتنی کم ہیں کہ ان کی بنا پر آہ غزل گو شعراء کی صف میں پاؤں جما کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ آہ نے اپنی غزلوں میں

غنائی اور غیر غنائی کلام کے درمیان جو حد فاصل کھینچی ہے وہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ ان کے غنائی کلام میں بھی ایسے شعر بھرے پڑے ہیں جو بہترین ادب پارے کہے جائیں گے۔

آہ غزل کو اُردو شاعری کی مبتدی صنف اور اردو شاعری کی منتہی صنف کہتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ میرے شباب تک اساتذہ جب تک کسی شاعر سے غزل کے کچھ شعر نہ سُن لیں اس کے مرتبۂ شاعری کا تعین نہیں کرتے تھے۔ میں نے جب اپنی جگہ پر غور کیا تو مجھے اس بات کے پیچھے چھپی ہوئی صداقت کا بہ شدت احساس ہوا قصیدہ، نظم یا کسی دوسری صنف میں شاعر کا جوہر شاعری کھل کر اس طرح سامنے نہیں آتا جس طرح غزل کے چند شعروں میں آجاتا ہے۔ دوسرے اصناف سے شاعر کے مرتبۂ شاعری کو سمجھنے کے لئے اس کا کسی قدر تفصیلی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

آہ کو اپنے لئے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ وہ غزل کی حسب دل خواہ خدمت نہ کر سکے۔ ان کے خیال میں اچھی غزل کہنے کے لئے غزل کا ماحول اور شاعری کی اس صنف کی طرف بھرپور توجہ ضروری ہے۔ یہ سچ ہے کہ حالات نے آہ کا رشتہ غزل کے ماحول سے بھی منقطع کر دیا۔ اور وہ غزل کی طرف پوری توجہ کبھی نہ کر سکے۔

جدیدیت کو آہ جنون زدگی کہتے ہیں، لیکن یہ بات وہ بھی مانتے ہیں کہ غزل ہر پچیس تیس سال کے بعد نیا جامہ پہننے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ جامہ آہ کے خیال میں روایت ہی کی مقراض سے قطع ہونا چاہیئے۔

"ادب برائے زندگی" کے نظریے کی آہ پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر کوئی علیل ذہن (Pervert) ایسے ادب کی تخلیق کرتا ہے جو انسانی معاشرے کے لیئے مضر ہے تو اسے دریا برد کر دینا چاہئے۔ عقلِ نو کو ہیپی دماغ نہیں ایک صحت مند دماغ چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں ؎

ذہنِ علیل سہہ نہ سکا بارِ عقلِ نو
اتنی شراب تند تھی بوتل درک گئی (غزل پارے)

آہ کی ۴۳ء تک کی غزلوں کا ایک انتخاب نکلا تھا۔ جس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ جس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا صفی، آغا شاعر، پروفیسر مسعود حسن ادیب اور اثر لکھنوی وغیرہ نے اس مجموعے کو سراہا۔ لیکن آہ اپنے ۳۶ء سے قبل کے تمام کلام کو رد کر چکے ہیں۔ لہذا ان کی ۳۶ء کے بعد کی غزلیں ہی زیر بحث آئیں گی جو بے حد کم ہیں۔

آہ جیسے مشاق استاد کی غزلوں میں ایک مخصوص رنگ اور جداگانہ انداز ہونا چاہیئے تھا۔

لیکن ان کی پیش کردہ غزلوں میں کئی مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ آہ کہتے تھے کہ جب میں غزلیں کہوں گا تو غزل کو ایک نیا رنگ دوں گا۔ ہو سکتا ہے اسی رنگ کی تلاش میں وہ مختلف اوقات پر رنگارنگ شعر کہتے رہے ہوں۔ ان اشعار میں کمی صرف یہ ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ورنہ حقیقتہً یہ شعر نئے لہجے اور نئے مضامین کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں۔

ذرا یہ شعر دیکھئے ؎

ہوا یک بات تو اس کا کوئی جواب ملے سوال چیخ رہے ہیں مگر سوالوں میں

بات وہی ہے جو سب کہتے ہیں۔ لیکن کہنے کے انداز نے شعر کو بالکل جدید بنا دیا ہے ؎

بسا لی ہے یہ بنجاروں نے بستی نہ جانے کب اکھڑ جائے گا ڈیرا

حقیقت کے نام رکھنا یا صفات بتانا جہلِ حقیقت ہے ؎

نام بھی رکھے، گُن بھی بتائے بڑے بڑے گُن والوں نے
تیرا پردہ بھی نہیں ہلتا، کہتے آ کے پکار گئے

حیات اجل کے سائے میں ہے ؎

رقص سایے اجل کے کرتے ہیں جھلملاتا رہا چراغِ حیات

اس شعر کا تاثر بھی قابلِ توجہ ہے ؎

گھٹن ہوا میں چمن خوں چکاں، طیور خموش
کہاں یہ آ گئی لیکر مری حیات، مجھے

غم ایک گراں بہا دولت ہے۔ لیکن اس کا بار اٹھانا آسان نہیں ؎

لائقِ غم نہیں خود ظرف ہی اپنا ورنہ تیرا اے نعمت یکتائے جہاں کیا کہنا

اگر چشمِ ہوش سے دیکھا جائے تو کائنات ایک طلسم خانۂ حیرت نظر آئے گی ؎

پلک جھپک نہ سکا خاک کا کوئی ذرہ طلسم خانۂ حیرت ہے کائنات نہیں

آہ اپنے دورِ گزشتہ کو بڑے پُر اثر انداز سے یاد کرتے ہیں ؎

وہ بزم ختم ہوئی اب نہ آئے گا ساقی جو پی چکے ہیں اسی کا خمار رہنے دے (غزلیات)

آہ کی صحرا نشینی اور بے پروا خرامِ زندگی سے کبھی کبھی ان پر Mystic ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ لیکن بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں انھیں شفاف ذہن کا ایک حقیقت پسند مفکر کہنا زیادہ پسند کروں گی Mysticism سے انھیں دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ اپنی ایک نظم میں وہ اپنے نقاد سے کہتے ہیں ؎

میرے ناقد مجھے مستانِ قلندر نہ بنا زیرِ تہذیب فراست ہے مرا میخانہ

موت کا خوف آہ کے نزدیک زندگی کا بے حد اہم مسئلہ ہے جس نے انسان کے رہنے اور سوچنے کے طریقے بدل دیئے ہیں۔ اسی خوفِ مرگ کے زیرِ سایہ حیات بعد ممات کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔ جس میں اُلجھ کر آدمی کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ آہ کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے موت کے اس بنیادی سوال پر کافی غور کیا ہے۔ مگر ان کے یہاں موت کوئی ڈراؤنی یا عبرتناک چیز نہیں، وہ موت کو حیات کا جزو اور قانونِ ارتقا (Law of Evolution) کا ایک قدم سمجھتے ہیں ؎

قانونِ ارتقا ہے بنیادِ وجود　　خود موت ہے اک جہتِ ترقی کی طرف (دنقش)

موت کے فلسفے پر آہ کی ایک بہت اچھی نظم ہے "انسان کبھی نہیں مرتا" کسی نوخیز ادیب نے اس نظم کو منافیِ ترقی پسندی قرار دینے کی کوشش کی تھی۔ موت سے آدمی کو ڈرا کر مایوس و بے عمل بنانا قطعاً ترقی پسندی کے خلاف ہے۔ لیکن اس نظم میں تو خوفِ مرگ کو دل سے نکال کر انسان میں عمل کی روح پھونکی گئی ہے۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

ایک رات کو شاعر کے دل پر خوفِ مرگ مسلط تھا۔ وہ پریشان تھا کہ میں اجل کے اندھیرے میں گم ہو کر بے نشان ہو جاؤں گا۔ آسمان کا ایک چھوٹا سا ستارہ اس کی اُلجھن دیکھ کر ہنسا اور کہنے لگا۔ ع

کوئی مرتا نہیں جو ہے وہ ہمیشہ ہوگا۔

پھر ستارہ کہتا ہے۔ دیکھ میں رات بھر تیری محفل میں رہتا ہوں۔ لیکن سویرے مجھ پر ایک پردہ پڑ جاتا ہے ؎

موت اور زیست حجابوں کا ہے اُٹھنا گرنا　　ہو رہا ہے اسی صورت میں مسلسل یہ رہس

ستارہ کہتا ہے کہ حیات جزو کو نہیں کہتے۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے ؎

بیج پھر اس سے شجر اور شجر سے پھر بیج　　دائرہ وار اسی طرح سے پھرتا ہے وجود
آج بھی زندہ ہے وہ ایٹمی اسپتنک میں　　جس نے کل بھاپ کی قوت کو کیا تھا معلوم
اوّل دائرہ چکر میں ہے ہر پہیے کے　　سحرِ غالب میں جھلکتا ہے ولی کا مفہوم

ستارہ کہتا ہے کہ "حال ہی ماضی" اور "مستقبل" کے درمیان کا ربط ہے۔ اسی ربط کو اپنے عمل سے مضبوط کر ؎

حال میں رنگِ عمل بھر کے اسے واضح کر　　حال سے ہے ترے فردا کی وضاحت مشروط
یاد رکھ آہ کہ انساں نہیں مرتا ہے کبھی　　زندگانی میں ازل اور ابد ہیں مخلوط
(گلبن)

اس حیات بخش اور عمل آموز نظم پر منافی ترقی پسندی ہونے کا الزام لگانا محض خام ذہنی ہے حقیقت یہ ہے کہ فلسفی شاعر نے اس نظم میں عمل کا پیغام ایک نئے انداز سے دیا ہے۔

آہ حیات کو بالاجزاء نہیں دیکھتے، وہ اسے ایک مجموعی شکل میں ساری نوعِ انسانی سے منسوب کرتے ہیں ؎

یہ کارگہہ حیات لافانی ہے   مقصود مسلسل کی فراوانی ہے
اجزا مرتے ہیں کل نہیں مرتا ہے   تو فرد نہیں ہے نسلِ انسانی ہے (نقش)

آہ کی نظر حیات کے عظیم ترین مستقبل پر رہتی ہے۔ وہ آج کے مصائب کو آنے والی مسرتوں کے لئے عمل تخلیقی سمجھتے ہیں ؎

کارِ تعمیر بہاراں میں ہیں شعلے فی الحال
ساون آتا ہے بس اب جیٹھ کی حدت کو نہ دیکھ
آج کا خون ہے رنگِ گلِ فردا کے لیے
دردِ زخمِ دلِ مجروح کی شدت کو نہ دیکھ (گلبن)

ایک رباعی میں وہ انسان کا حوصلہ اس طرح بڑھاتے ہیں ؎

اس آج کی پستی سے نہ بد دل ہونا
اک کوہِ عروج ہے ابھرنے والا (زمزمہ)

آہ کا طریقۂ فکر روایتی تو نہیں۔ لیکن دقیق بالکل نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو بزورِ منطق ثابت کرنا نہیں چاہتے۔ وہ تو بات کو ایک بدیہی شے کی طرح دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سورج ہے، اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

زندگی میں عمل آہ کے نزدیک سب سے اہم چیز ہے ؎

مجھ سے جو زندگی کے معنی پوچھو   میں تو یہ کہوں گا کہ عمل صرف عمل

ان کا انسان زلفِ حیات کو سنوارتے ہوئے پکارتا ہے ؎

یہ خارزارِ جہاں صاف کر رہا ہوں میں   زمین پر ہے بنانا مجھے خود اپنا بہشت

اور پھر جب حیات کا حسن نکھرتا ہے تو وہ خوش ہو کر کہتا ہے ؎

گل نئے، برگ نئے، سبزہ و اشجار نئے   نئے جلووں سے مزین ہے بہارِ گلشن
(گلبن)

آہ نئی دنیا کو زمینی تہذیب کی دنیا سمجھتے ہیں ؎

دب گئے خاک کی اگتی ہوئی تہذیبوں سے   آسمانوں سے وہ آئے ہوئے اقدار (گلبن)

حیات خود معلول بن کر علتِ نو پیدا کرتی ہے ؎

کرتی ہے حیات آپ سامانِ حیات ۔۔۔ ہل آج چلا رہا ہے دہقانِ حیات
فردا کا ہو رہا ہے کارِ تعمیر ۔۔۔ کل جھوم اٹھیں گے گندمستانِ حیات

(زمزمہ)

آدمی کے مسکنِ زمین کو آہ تمام ثوابت و سیارے سے افضل سمجھتے ہیں ؎

یہ ستارے ہیں بجز یہاں کچھ نہیں ۔۔۔ ہے فقط خاک یہ زندگی کا امیں
راز یہ چاند پر جا کے جب کھل گیا ۔۔۔ تو زمیں فخر سے گنگنانے لگی

(غزل پارے)

ترقی پسندی جسے ارتقائے حیات یا فلاح نوعِ بشر کہا جائے گا آہ کی فطرت کا جزو ہے۔ جس وقت ترقی پسندی ایک تحریک کی صورت میں ابھری تو اس کے سب سے پہلے جلسے سے آہ اس کے حامی بنے۔ اس وقت آج ہی کی طرح دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف تھے استحصال کرنے والے اہلِ زر اور ان کے اجیر حامی، یا دہ رجعت پسند دنیا۔ کی ہر ترقی کی مخالفت میں شور مچاتے ہیں ؎

دیارِ زر کے نقیبوں کا شور ہونے دو ۔۔۔ ہمیں ہے خوب وہاں کی گلی و فضا معلوم

(غزل پارے)

اور دوسرے کیمپ میں تھے محنت کش عوام جن کا استحصال کیا جا رہا تھا اور ان مظلوموں کے حامی انقلاب پسند، آہ نے آخر الذکر کیمپ کی حمایت کی۔ وہ اپنی ایک نظم میں ظالم سماج کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

خونِ مزدور چراغوں کا جہاں روغن ہے
جہاں چکّی میں دلے جاتے ہیں اربابِ ہنر
ہاں میں باغی ہوں مگر میری بغاوت کو سمجھ
مجھ کو مطعون نہ کر ہمدمِ کوتاہ نظر
دیر و مسجد کی وزارت تو ہے تو زر کی شاہی
بھالیاں جھول رہی ہیں جدھر اٹھ جائے نظر ۔۔۔ (گلبن)

شاعر نے اس نظم میں سرمایہ دار سماج کی وہ مکروہ تصویر کھینچی ہے کہ سرمایہ داری سے نفرت ہو جاتی ہے۔

اسی طرح بمبئی اہلِ دولت کا شہر اور ہندوستان کا عروس البلاد سمجھا جاتا ہے۔ بمبئی پر بہت سے

شاعروں نے نظمیں کہی ہیں، لیکن آہ نے اپنی نظم "بمبئی" میں بمبئی کو جس نے اور حقیقت پسندانہ زاویے سے دیکھا ہے اس طرح کوئی دوسرا شاعر نہیں دیکھ سکا ہے۔ یہ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے :-

یہ دیارِ بمبئی، یہ معدنِ زر، زر سرشت
یہ غریبوں کا جہنم یہ امیروں کی بہشت

چوڑے چوڑے راستوں پر موٹروں کی ریل پیل ہے اور شاعر کی انسان دوست نظر ایک مکروہ ترین واقعہ دیکھتی ہے :-

- چیخ کی آواز آئی وہ گرا اک ناتواں،
وہ چلے موٹر کے پہیے کڑ سے بولیں ہڈیاں
ایک دم میں ہوگئی گز بھر زمیں وہ خونچکاں
ایک بولا "اے سالا بیچ میں آیا کہاں"
مُردہ گاڑی آئی لاش اُٹھی تماشا ہوگیا
مہتروں نے خون دھویا صاف رستہ ہوگیا

مزدوروں کی چالیوں کا دل خراش منظر :-

آہ مزدوروں کی بوسیدہ گھناؤنی چالیاں
رقص کرتی ہیں جہاں پر عزبتیں، بدحالیاں
خوں ملے بلغم کی دیواروں کے اوپر لالیاں
مثلِ افعی رینگتی پھرتی ہیں گندی نالیاں
دق، تپ، دلرزہ یہاں پر روز و شب مہماں ہے
اور اس مہمانِ بد کا میزبان انسان ہے (دگلبن)

مزدور سے آہ کی ہمدردیاں بہت گہری ہیں۔ مزدوروں کے موضوع پر انھوں نے جو کچھ کہا ہے اثر میں ڈوب کر کہا ہے۔ سارے ادب اردو میں مزدور کی عظمت بہترین صورت میں اس رباعی میں ملتی ہے :-

اسبابِ تعیش کا سفینہ آیا
انسان کو رہنے کا قرینہ آیا
پوچھا میں نے جو عیشِ عالم کا سبب
مزدور کے ماتھے پہ پسینہ آیا

آہ میں فن کارانہ انا بہ شدت ہے۔ جب انھیں اپنے مرتبہ شناس نہیں ملتے تو وہ جھلا کر کہتے ہیں ؎

کس مجمعِ ابلہاں میں بھیجا یا رب
اب اس سے سوا کیا ترا دوزخ ہوگا

لیکن وہ محترم شاعروں کے پرستار بھی ہیں ؎

اک نشتر، ایک صبحِ معنی کا سرو دستی
اک کوثر، اک حکیم، اک برق بدوش
یہ پانچ ہیں آفتاب، اردو کے جری
میر و غالب، انیس و اقبال و جوش (نقش)

آہ حقیقتہً اُردو رباعی کے مضبوط ستون ہیں۔ اُردو رباعی کی تاریخ ان کی رباعیوں کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ فلسفیت، نئے نئے لہجے، نئے نئے تجربے، انقلابی انداز، طنز، رومان، مصوری غرض جو رنگا رنگی آہ کی رباعیوں میں ہے وہ بہ ہمہ حیثیت منفرد ہے۔ آہ کے کلام میں دو چیزیں بیحد اہم ہیں۔ "نو بہ نو" اور ان کی رباعیاں۔ پچھلے سطور میں آہ کی رباعیاں کافی آچکی ہیں۔ یہاں مجھے ان رباعیوں کے کینوس کا پھیلاؤ اور ان کے تنوع کی جھلکیاں پیش کرنا ہیں۔

اپنی ذات کا تھکا دینے والا تجسس اور نتیجہ "لا" پھر اس "لا" کے پیچھے ہم خود ؎

ہر چند کہ میں نے غل مچایا میں کون؟
لیکن نہ کسی نے یہ بتایا میں کون؟
خود اپنی ہی بازگشت آواز سنی
"میں کون ہوں؟" صدا۔ جواب آیا میں کون؟" (زمزمہ)

انتظار میں دل کی دھڑکن کی انوکھی تشریح ؎

وعدہ تو تھا کہ وقتِ شب آئیں گے
اللہ! مرے گھر میں وہ کب آئیں گے
ہر ضرب یہ کہہ رہی ہے دل کی دھڑکن
اب آئیں گے، اب آئیں گے، اب آئیں گے (زمزمہ)

ڈرامے کے لازمی اجزاء ہیں کہانی، مکالمہ، سسپنس اور کلائمکس، یہ رباعی دیکھئے جو مکمل ڈرامہ ہے ؎

کل رات کو یہ چاند سے میں نے پوچھا
ہے تجھ سا حسین کوئی دنیا میں بتا
وہ بولا کہ "صرف ایک" میں نے کہا "کون؟"
جل کر کہنے لگا کہ "محبوب ترا" («نقش»)

برسات میں پانی سے بھرے ہوئے ایک تھالے کی تصویر پس منظر کی لے کے ساتھ شاعر نے تصویر کو گرفت میں لے لیا ہے۔ باراں کے ساتھ رباعی کی لے بھی حرکت کر رہی ہے ؎

دھیمی دھیمی فلک سے مدہوش پھوہار
رم جھم رم جھم عروس باراں کا ستار
چھوٹے چھوٹے حباب مٹتے بنتے
تھالے تھالے تڑپتی لہروں کی قطار

ایک حسین معاملہ بندی ؎

ہونے لگی اب تو مری رسمی تکریم
تخصیص پہ چھا گیا ہے رنگ تعمیم
میں نے جو کہا "آپ ہیں جانِ ارماں"
وہ طنز سے مسکرا کے بولے "تسلیم" (زمزمہ)

اپنی پیری سے مذاق ؎

اے عمر تری لکیر پیٹیں کب تک
مُردہ ماضی کا یہ گھسیٹیں کب تک
یوں ہم پہ حسین مرتے تھے، یوں مرتے تھے
ہانکو گے تڑے میاں یہ ڈینگیں کب تک (زمزمہ)

اس رباعی کے طرز بیان کی ندرت دیکھئے ؎

کل رات کو یہ آہؔ ادیب دوراں
یوں پوچھتے پھرتے تھے کسی گھر کا نشاں
تارا کے مکاں کے پاس مسجد ہے کدھر
رہبر نے کہا کہ "وہ ہے تارا کا مکاں"

(زمزمہ)

آہ کے ذہن کی اُپج پندرہ سال سے ایسی رباعیاں تخلیق کر رہی ہے۔ جن کو

وہ ہندی رباعیاں کہتے ہیں۔ اپنی ہندی رباعیوں کے متعلق انھوں نے کہا ہے۔

"رباعی کا پرانا نام ترانہ تھا۔ جو بیشتر گائی جاتی تھیں اسی خصوصیت کی بنا پر ہندی کار رباعیاں اس زبان میں کہی گئی ہیں۔ جس میں اردو شاعر گیت لکھتے ہیں۔ گیت کی زبان ہر جگہ اردو ٹکسال کی پابند نہیں ہوتی۔ دوسرے "ہندی" فارسی سے درآمد کیا ہوا ایک اردو لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں "انڈین" یہ لفظ مسلمانوں کے آنے کے بعد ہی ہندوستان میں رائج ہوا۔ مسلمانوں سے پہلے اس لفظ کا وجود کسی دیسی زبان میں نہ تھا۔ ہندی بمعنی انڈین اب تک اردو میں رائج ہے۔ آج بھی اردو والے دیسی الفاظ کو "الفاظ ہندیہ" اور دوسری زبان کے تدبھو لفظوں کو الفاظ ہند کہتے ہیں۔ غالب نے اپنے نثری اردو مجموعے کو "عود ہندی" کا نام دیا ہے۔

آہ نے اپنی ہندی رباعیوں پر ایک مزید پابندی یہ عائد کی ہے کہ ان میں عربی اور فارسی کا کوئی لفظ نہیں آنے دیا ہے۔ گیت کی خالص دیسی زبان کی یہ شکل انشا اور آرزو سے مختلف ہے۔ رباعی جیسی دقیق صنف پر اس قسم کے تصرفات وہی اساتذہ کر سکتے ہیں جو زبان و فن کے ماہر ہیں۔

عربی فارسی لفظوں کے بغیر اردو سے اظہار عقیدت ؎

اس دیس کی یہ سب سے پیاری بولی
یہ لکھنؤ دلی کی سنواری بولی
ہیرے موتی سے بڑھ کے ہیں اس کے بول
داتا! بھولے بھلے ہماری بولی (نقش)

پنہاری پنگھٹ سے قیامت ڈھاتی آرہی ہے ؎

دکھلاتی ہوئی روپ چھماچھم آئی
پنگھٹ سے بھر کے جل جھماجھم آئی
پایل کی جھنک سے جی ہوا ڈانواڈول
گج گامنی البیلی چھماچھم آئی

برہن کو اپنے پردیسی کی یاد ؎

کیا بات بتاؤں آج کی تجھ کو سکھی
مندر میں سویرے جو میں درشن کو گئی
دیکھا تو ٹھاکر کی مورت کی جگہ مسکاتا کھڑا تھا پردیسی

فارسی اور عربی کے بغیر یہ قیامت خیز، جوان رباعی سے

ہلتی ہوئی گالوں پہ یہ بالوں کی لٹ
دونوں آنکھیں ہیں جیسے اوس کے پنگھٹ
انگڑائی جو لی ہاتھ اٹھا کر اس نے
ٹوٹیں انگیا کی گانٹھیں چٹ چٹ چٹ چٹ
(دشت)

اس مجموعے میں ہندی رباعیوں کا انتخاب شامل ہے۔

آہ کے منظوم ڈرامے "عقل کی شکست" کو صنف رباعی کبھی نہیں بھلا سکے گی۔ اس ڈرامے میں کردار کے مطابق مکالمے، ڈرامے کا زیر و بم، نئے نئے لہجے اور حسن زبان قاری کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ ڈرامے میں تین کردار ہیں۔

۱۔ حسینہ ۔ ایک الھڑ حسینہ، ناتجربہ کار اور جذباتی۔
۲۔ عقل ۔ ایک معمر عورت اپھرے پر جھریاں، گورا رنگ۔ آنکھوں میں فلسفیت۔
۳۔ شباب ۔ ایک نوجوان، مضبوط بازو، چوڑا سینہ، آنکھوں میں مستی، مزاج میں ظرافت۔

(پردہ اٹھتا ہے)

(بہار، چاندنی رات، باغ، سنگ مرمر کے ایک تخت پر حسینہ پڑی ہوئی گنگنا رہی ہے)

حسینہ:۔ یہ چاندنی رات، یہ گلستاں، یہ بہار
پلٹیں، خوشبو، فضائیں سب عنبر بار
کھوئے کھوئے سے سنناتے ہوئے سرو
بہکی بہکی ہوائے صحن گلزار

جی چاہتا ہے کہ بس کسی کی ہو جا
سینے پہ کسی کے رکھ کے عارض سو جا
دکھتے ہوئے اس جسم کو تسکین ملے
مضبوط کسی کے بازوؤں میں کھو جا

(گرج کی ایک آواز آتی ہے اور اسٹیج کے داہنے گوشے سے عقل غصے میں بھری ہوئی داخل ہو رہی ہے)

عقل:۔ اے وائے بہ تو طفلک ناتجربہ کار
کیا تو نے کہا یہ؟ پھر تو کہنا اک بار

کس کے مضبوط بازوؤں کی ہے تلاش
میں بھی تو سنوں کون ہے وہ نا ہنجار

(حسینہ سہمی ہوئی کھڑی ہے۔ گرج کی آواز پھر آتی ہے اور شباب اسٹیج کے بائیں گوشے سے داخل ہوتا ہے)

شباب :- بس بس اے عقل بس خدا کے لیے بس
بکواس تری سننے کا مجھ میں نہیں کس
برسا نہ یہاں یہ ضرورت پانی
مجھ کو جو ہو سنانا ہے کہیں اور برس

.. .. .. تخریب زمانے میں ہے جتنی پھیلی
"اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست"

عقل :- للکارنے والے مجھ کو اے خانہ خراب
اے وحشی بے شعور دیوانے شباب
تکریم، نہ تعظیم، نہ عزت نہ سلام
سیکھے ہیں یہی تجھ کو کرے تو نے آداب

.. .. مجھ سے یہ ہنسی کیوں ہے یہ مجھ پر چوٹیں
"بازی بازی بہ ریش بابا بازی"

عقل اور شباب میں ترکی بہ ترکی پُرجوش حکیمانہ اور طنزیہ مکالمے پہلے چھ چھ رباعیوں میں چلتے ہیں پھر دونوں بڑھ کر حسینہ کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ ڈرامے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ پہلے رباعی دو حصوں میں بٹتی ہے۔ یعنی رباعی کے دو مصرعے عقل اور دو مصرعے شباب بولتا ہے پھر رباعی چار حصوں میں بٹتی ہے یعنی رباعی کا ایک مصرع عقل اور ایک مصرع شباب بولتا ہے۔ پھر رباعی آٹھ حصوں میں بٹتی ہے۔ یعنی دونوں کردار نصف نصف مصرعے کا مکالمہ بولتے ہیں۔ یہاں تک کہ رباعی چودہ حصوں میں بٹتی ہے ۔

شباب میں کیف
عقل نہیں
شباب میں جام صہبا ہوں
عقل نہیں

شباب:- میں کردوں
عقل:- نہیں
شباب:- میں ایک تنہا ہوں
عقل:- نہیں
شباب:- میں اسے لے کے حسینہ کو چلا
عقل:- تیری مجال ؟
شباب:- رستہ دے
عقل:- نہیں
شباب:- دیکھ میں جاتا ہوں
عقل:- نہیں

شباب ایک جھٹکے سے حسینہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ عقل منہ کے بل گرتی ہے۔ شباب حسینہ کو گود میں اٹھا لیتا ہے۔

حسینہ:-
تسلیم! ادب سے خالہ اماں تسلیم!
بس ایسی تو جلی کٹی کہیے مت حال سقیم
جب لوٹ کے پچاس کا ہرا ہوگا سن
تب آپ کے حضور سے میں لوں گی تعلیم

(ایک فتحمندانہ موسیقی کے ساتھ شباب حسینہ کو لے کر چلا جاتا ہے)

عقل:- (سر پکڑ کر اٹھتے ہوئے)
اُف میری شکست آج یہ میری شکست
مجھ سے یہ فساد اور یوں دست بہ دست
شیطان پیمبری کو جیتا تو نے
پستی کا ہوا عروج بالا ہوا پست

(عقل لڑکھڑاتی ہوئی جاتی ہے) (پردہ گرتا ہے) (زمزمہ)

اس اجمالی جائزے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ندرت بیان اور تنوع فکر کے ساتھ ساتھ آہ کے پاس حیات اور مسائل حیات کے لیے سب سے الگ خود اپنا فلسفیانہ نقطۂ نظر بھی ہے اور یہ بات اُن کے بڑے شاعر ہونے کی ایک بدیہی دلیل ہے۔ آہ کا یہ نقطۂ نظر اگر کسی منظم مذہب یا شرانگیز سیاسی جماعت کی تائید میں ہوتا تو لوگ گلا پھاڑ پھاڑ کر اس کی

حمایت کرتے اور اسے سر پر اٹھا لیتے۔ لیکن یہ تو سارے روایتی اور رواجی نظریوں سے متضاد ہے۔ آہ کو سکنڈ ہینڈ ذہن اور سکنڈ ہینڈ تصورات سے سخت تنافر ہے۔

آہ کے کلام میں اگر کسی نظریے کی تائید ملتی ہے تو وہ صرف مارکسزم ہے۔ لیکن یہ تائید عقلی اور منطقی ہے۔ کسی عقیدے کی بنا پر نہیں۔ عقیدے کے لیے وہ کہتے ہیں ؎

ہے عقیدے کی اصل یہ تعریف
سوچنے کی جہاں نہ ہو تکلیف (دنوبہ نو)

آہ کے نزدیک عقیدے سے زیادہ لغو اور ناکارہ کوئی چیز نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں عقیدے کا بڑا احترام ہے، خدا پر عقیدہ، مذہب پر عقیدہ، مرشد پر عقیدہ وغیرہ وغیرہ۔ عقیدے کے بعد اپنے عقیدے سے متعلق ہر معقول اور نامعقول بات کو آنکھ بند کر کے مان لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ بھوت ہیں، جن ہیں، ملائکہ ہیں، دیوی دیوتا ہیں۔ لہٰذا اب ان سب باتوں پر کسی عقلی گفتگو کی گنجائش نہیں رہتی۔ اصل میں عقیدے سے وہی چیزیں پیدا کی جاتی ہیں جو حقیقت نہیں ہوتیں۔

آہ نے مارکسزم کو ایک دانشور کی طرح سوچا اور سمجھا ہے۔ وہ مارکسزم کی حمایت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ تاریخ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ آہ مارکسزم کو بھی آخری اور محنت نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ مارکسزم انسانی ارتقا کا صرف ایک زینہ ہے، کل حالات بدلنے پر مارکسزم بھی حرف غلط بن سکتا ہے۔ روس وہ ملک ہے جہاں مارکسی معاشرے کی ابتدا ہوئی۔ لیکن آہ کی نظر میں اسٹیلن کے بعد کے روس میں اور امریکہ میں کوئی فرق نہیں رہا، دونوں نے دوسرے ملکوں پر براہ راست یا بالواسطہ حملے کیے ہیں۔ خاص کر چین جیسے نوزائیدہ عظیم ترین مارکسی ملک کے ساتھ روس کا برتاؤ سخت قابل اعتراض رہا۔ آہ روس کی ان تمام برائیوں پر سخت تنقید کرتے ہیں۔

وطنیت آج کی دنیا کا جنون ہے۔ آہ اس جذبے کو اجتماعی انسانیت کے تصور کے خلاف علاقہ پرستی، علاحدگی پسندی اور فرقہ پرستی کی توسیع سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

انساں وطنیت کی ضلالت سے نکل
کونین کا بادشاہ ہونا ہے تجھے (زمزمہ)

قارئین کو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا کہ آہ جیسے مختلف النوع مفکر کو ذہن نشین کرانے کے لئے میں مغربی اور مشرقی فلاسفہ کے نام قدم قدم پر نہیں لے رہی ہوں۔ ہمارے لکھنے والے مختلف ناموں اور حوالوں کو اس قسم کی تحریر میں لپیٹ کر شاید پڑھنے والوں

کے علم میں کچھ اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس طرح ہم نفسِ موضوع سے دور ہو جاتے ہیں، مجھے گفتگو صرف آہ کی شاعری کے متعلق کرنی ہے اور میں اپنے تناظر میں صرف اپنے موضوع ہی کو رکھنا چاہتی ہوں۔ غیر ضروری باتوں سے اپنے بیان کو پیچیدہ اور طویل بنانا نہیں چاہتی۔ غیر ضروری حوالوں سے اصل بات پس پشت چلی جاتی ہے اور غیر متعلق باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ ہاں کسی بھی مفکر کا ذہنی پس منظر جاننا ایک ضروری چیز ہے۔ اور میں اپنی معلومات کی روشنی میں آہ کے ذہنی پس منظر کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتی ہوں۔

آہ کا سالِ ولادت ۱۹۰۵ء تاریخ میں ایک عالمگیر انقلابی سال سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ زمانۂ پیدائش کا اثر مولود پر ضرور پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آہ کے باغی مزاج پر ان کے سنہ ولادت بھی کا اثر ہو۔

آہ کی والدۂ محترمہ بے حد مذہبی خاتون تھیں۔ وہ اپنے اکلوتے لڑکے کو عالم دین بنانا چاہتی تھیں۔ انھیں کی خواہش کے مطابق آہ کو عام تعلیم کے ساتھ فارسی اور عربی کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ آہ کا ماحول لکھنوی تہذیب وادب کا شائستہ ترین ماحول تھا۔ انھیں پڑھنے کے ساتھ کڑھنے کا بھی بہترین موقع ملا۔ شامِ اودھ میں رچ کر بچپن میں آہ کچھ عرصے تک بھدوہی اور بنارس کے ماحول میں بھی رہے۔ اور وہاں گنگا کے حسن، صبحِ بنارس اور برہمنوں کے چندن لگے ہوئے پُراسرار ماتھوں کا گہرا عکس ان کے ذہن پر پڑا۔ ان کی شدید اردو دوستی کے ساتھ ہندی علوم میں ان کی مہارت شاید لکھنؤ اور بنارس کے امتزاج ہی کا نتیجہ ہو۔

آہ نے ہوش سنبھالا تو پہلی جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ یہ سچ ہے کہ یہ جنگ ہندوستان میں نہیں یورپ میں ہوئی۔ لیکن لاکھوں ہندوستانی سپاہی بھرتی کر کے جنگ کی بھٹی میں جھونک دیے گئے۔ پھر ہندوستان میں انگریزوں کے جبر کی حد یہ تھی کہ اقبال ایسے شاعر کو بھی جبری حکم سے مجبور ہو کر انگریزوں کی مدح میں ایک نظم کہنا پڑی۔ اس جنگ کے بعد جب جلیانوالہ باغ میں ڈائر کی گولیاں ہندوستانیوں کا خون بہا رہی تھیں، تقریباً اسی وقت آہ کی شاعری کا پہلا نمونہ ہمارے سامنے آیا۔ یہ نمونہ ایک غزل ہے۔ اس میں لاشعوری طور پر بے بسی کے آنسوؤں کی نمی موجود ہے۔

اس غزل کا مطلع تھا۔

سیکھے طرزِ فغاں بلبل دلِ ناشاد سے
روتی ہے شبنم بھی میرے نالہ و فریاد سے

اس وقت آد میں سیاسی شعور کا تجسس فضول ہے۔ لیکن ماحول کا دباؤ ان کے احساس پر بھی پڑ سکتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ غمناک غزل ہوگی۔

ڈائر کے ظلم نے ہندوستان کو متحد کر دیا۔ گاندھی جی کو اینی بیسنٹ نے مہاتما کا خطاب دیا۔ جسے قبول کر کے وہ فقیرانہ پوشاک پہن کر میدان میں نکل آئے۔ گاندھی جی کی صلاحیتوں سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے فقیرانہ لباس اور ان کی مہاتمائی نے انھیں ہندوستان کا لیڈر بننے میں بہت بڑی مدد دی۔ اگر وہ بیرسٹر گاندھی کی طرح میدان میں آئے ہوتے تو ان کو یہ کامیابی قطعاً نہ ملتی۔

۱۹۲۱ء کی تحریک اور ہندو مسلم اتحاد در اصل ایک جذباتی ہنگامہ تھا جس تیزی سے یہ اٹھا تھا اتنی ہی جلد ختم بھی ہو گیا۔ لیکن گاندھی جی کی مہاتمائی برابر ذہنوں پر چھائی رہی، اُس پر ضرب اس وقت لگی جب ام۔ ان رائے ہندوستان آئے اور گاندھیائی تصورات کے خلاف ان کے قلم نے شعلہ افشانی شروع کی۔ خود جواہر لال بھی ام۔ ان رائے سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ آد اس وقت ام۔ این رائے کے گرویدہ تھے۔ ان پر جواہر لال، مولانا آزاد، اور مہاتما گاندھی کا بھی کافی اثر تھا۔ اسی زمانے میں وہ تارکِ لحوم ہوئے اور اب تک سختی سے ویجیٹیرین ہیں۔

ام۔ ان رائے ایک آفتاب کی طرح طلوع ہوئے اور ایک کم مایہ ستارے کی طرح غروب ہو گئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں وہ کوئی محترم مقام نہیں پا سکیں گے۔ ان کی دانش اور عمل میں بہت بڑا فرق تھا۔

آٹھ دس سال کی مشق سے آد مشاعروں سے لے کر ادبی رسالوں تک کافی مقبول ہو چکے تھے۔ اُس زمانے میں وہ غزلوں کے علاوہ نظمیں، قصیدے، اور انگریزی، عربی، فارسی نظموں کے منظوم ترجمے بھی کرتے تھے۔ ان کا یہ کلام کہیں کہیں کرم خوردہ رسائل میں مل جاتا ہے۔ ترجمے کی منظوم صنف سے وہ بالکل مطمئن نہ تھے

ان کی ایک نظم کئی جگہ چھپی اور مقبول ہوئی۔ اس کا ایک شعر تھا ؎

بتیس کروڑوں کی آواز نہ کم سمجھو نعرے جو کیے ہم نے گردوں بھی ہلا دیں گے

ہندوستان کی ۲۳ کروڑ آبادی ۲۲-۱۹۲۱ء میں تھی۔ غالباً یہ نظم تقریباً اسی وقت کی ہوگی۔ آہ کو یہ یاد نہیں کہ یہ زمین خود ان کی طبع زاد ہے یا کسی سے ماخوذ ہے۔

آہ کی وطنی، نیچرل اور مختلف فرمائشی موضوعات کی نظمیں کافی پسند کی جاتی تھیں۔ مرثیہ گو خاندان سے متعلق ہونے کی وجہ سے انھوں نے دو ایک رزمیہ مرثیے بھی کہے۔ تلوار کی تعریف میں ان کا یہ بند مشہور ہے ؎

جوہر اس تیغ کا قرآں کے معانی جیسے
آب وہ آب کہ موتی میں ہو پانی جیسے
چال وہ چال طبیعت کی روانی جیسے
ایسی قتال حسینوں کی جوانی جیسے
گردنیں شوق سے تلوار پہ رکھ دیتے ہیں
بڑھ کے دل والے گلا دھار پہ رکھ دیتے ہیں

شاید ۱۹۲۶ء کی ایک تقریب میں غالب اور ذوق کے سہرے کی زمین میں آہ نے ایک سہرا کہا تھا جس کے مقطع میں غالب کے سہرے کو ترجیح دینے کا ایک نیا انداز نکلا تھا ؎

شعر سن کر ترے اے آہ یہ سب کہتے ہیں
کم ہے غالب سے یہ ہے ذوق سے بہتر سہرا

(یہ بمعنی لیکن غالب اور انیس کے یہاں ہے۔ آہ نے بھی اس وقت تک اس لفظ کو ترک نہیں کیا تھا)

اب اس مقطع کو پڑھ کر آہ ہنستے ہیں اور اسے غالب کی کورانہ پرستش بتاتے ہیں۔

اس وقت آہ شعرائے لکھنؤ کی ینگ پارٹی کے ایک اہم رکن اور لکھنوی غزل کے ایک نوخیز نمایندے سمجھے جاتے تھے۔ اُن کا کلام مشاعروں میں بھی پسند کیا جاتا تھا، اور گانے والے بھی ان کی غزلیں شوق سے گاتے تھے۔ آہ کی یہی خصوصیت غالباً انھیں فلموں تک لائی۔

آہ بڑے زود گو اور پُر گو شاعر سمجھے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں

سیتاپور میں فی البدیہہ مشاعروں کی ابتدا ہوئی تھی۔ جن کا یہ طریقہ یہ تھا کہ مشاق شعراء مقررہ شام کو جمع ہوتے تھے، خواجہ آتش اس زمانے میں غزل کا بہترین معیار سمجھے جاتے تھے۔ انھیں کا دیوان تمام شعراء کے سامنے کھولا جاتا تھا۔ داہنے صفحے کی پہلی غزل کی زمین طرح مانی جاتی تھی۔ تمھیں شعراء میں تقسیم ہو جاتی تھیں اور ایک گھنٹے کے اندر سب کو اپنی غزل کہنا پڑتی تھی۔ آہ باوجود کم سنی کے ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور تعداد میں مشاق استادوں کے برابر شعر کہتے تھے۔ ایک بار طرح نکلی، خوگر آئینہ، خنجر آئینہ وغیرہ۔ آہ نے ایک گھنٹے میں اس زمین میں گیارہ شعر کہے۔ جس میں سے ایک شعر یہ تھا ؎

سب سے پہلے حسن کی تصویر کر دی سامنے
میرے دل کو دستِ قدرت نے بنا کر آئینہ

آہ کی والدۂ محترمہ کا جب انتقال ہوا تو وہ تیرہ سال کے تھے۔ آہ کہتے ہیں کہ والدہ کے بعد گھر سے میرا جذباتی رشتہ بہت کم رہ گیا۔ اس ذہنی خانہ آزادی نے انھیں بہت کچھ دیا۔ آج وہ جو کچھ ہیں اس کا نقطۂ ابتدا ان کی نظر میں زندگی کا یہی موڑ ہے۔

"درعنفوانِ جوانی چنانکہ افتد و دانی" کے مطابق آہ بھی کچھ شدید جذباتی واقعات سے گزرے جن کے محرم راز دوست اب عدم آباد پہنچ چکے ہیں۔ ان کے کلام میں یہ اشارہ شاید اسی طرف ہو۔

کیوں آہ کیا اپنا تخلص تجویز
بس یہ بھی تقاضا مرے حالات کا تھا

ایک صاحب نے بتایا۔ انل لسواس میوزک ڈائرکٹر کے یہاں ایک شعری نشست تھی۔ آہ کے برابر جوش بیٹھے ہوئے تھے۔ آہ نے یہ رباعی پڑھی ؎

اجمال میں لا رہا ہوں تفسیریں میں
دل بہلے وہ کر رہا ہوں تدبیریں میں
اشکوں کے خطوط دے کے آڑے ترچھے
ماضی کی بنا ہوں تصویریں میں

جوش نے رباعی کی بہت تعریف کی۔ پھر آہ کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے

بعد بلند آواز سے کہنے لگے۔ " یہ رباعی تم نے کہی نہیں، تم سے کہلائی گئی ہے"۔ جوش آہ کے قریبی دوست رہے ہیں۔ ان کا یہ جملہ شاید کسی خاص بات کی طرف اشارہ ہو۔ خود آہ اس قسم کے واقعات کے لیے بس اتنا کہتے ہیں۔ ؎

اے مرغ سحر عشق زپر وانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

ہمارے شعراء محفلوں میں اپنے معشوقوں کی جو کہانیاں بیان کرتے ہیں، آہ ان کو ذہنی عیاشی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آہ کی نظم "میری شہناز" ایک حقیقت ہے۔ لیکن آہ نے اس بات کی کبھی تائید نہیں کی۔

غرض ملک کا شعور تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا جس کے ساتھ آہ کی شاعری بھی برابر ترقی کر رہی تھی۔

۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس نے مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کیا تو سیاسی فضا میں گرمی آ گئی۔ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کی نمک ستیہ گرہ ایک مذاق کی طرح شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک طوفان بن گئی۔ اس بار عوام میں ۱۹۲۱ء سے کہیں زیادہ سیاسی شعور تھا۔ لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ فرقہ وارانہ کشیدگی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جس کی وجہ سے مسلمان من حیث القوم اس تحریک میں شریک نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس میں ہندو پرست عناصر کو پھلنے پھولنے کا کافی موقع مل گیا۔ ادھر مسلم سیاست تیزی سے مطالبۂ پاکستان کی طرف بڑھنے لگی۔ ہندوستانی سیاست کا یہ بڑا افسوسناک موڑ تھا۔

۱۹۳۶ء سے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔ اور آہ اس کے پہلے ہی جلسے سے اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس تحریک نے ان کے بھٹکے ہوئے بے ضابطہ شعری جذبات کو ایک جہت اور سمت دے دی۔ یہیں سے وہ ایک بے جہت جذباتی شاعر اور بے سمت فکر پیما مفکّر سے ایک باشعور اور بالغ نظر ادیب بنے۔ اب جا کر ان کے لیے بہت کچھ کرنے کا وقت آیا تھا۔ لیکن دشواری یہ ہوئی کہ وہ فلم میں آ گئے۔ یہاں کامیابیوں نے انھیں اور بھی مصروف کر دیا۔ وہ اس تجارتی دنیا سے گھبرا کر ایک جگہ خود کہتے ہیں۔

افسوس ہے اے آہ یہ معلوم نہ تھا
گلُ ریز کو گلُ فروش بننا ہوگا

بقول آہ فلم کو علم سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ فلم کے کامیاب ۔۔۔ کامیاب ڈرامے ادب میں آج تک جگہ نہ پا سکے۔ فلم کے مقبول ترین گیتوں کو شاعری نے کبھی شعر کا مرتبہ نہیں دیا۔ فلم کے سنگیت کو موسیقی کے اساتذہ نے مطلق قابل توجہ نہیں سمجھا۔ فلم کا آرٹ کسی آرٹ کی دنیا میں آرٹ نہیں سمجھا گیا۔ دراصل فلم کا کام ایک خاص قسم کی تجارتی صنعت ہے۔ جس کے لیے مخصوص انداز کی صلاحیت یا جینیس کی ضرورت ہے۔

آہ اس فلمی دنیا میں چالیس سال رہے ہیں۔ ان کی تقریباً ربع صدی فلموں میں بڑی مصروف گزری۔ ہارٹ اٹیک کے بعد تقریباً سترہ سال سے ان کا قیام جنگل میں ہے۔ فلم سے اب ان کا رشتہ برائے نام رہ گیا ہے۔ لیکن آہ اس بات کو کبھی نہیں بھولے کہ وہ بنیادی طور پر ادیب اور شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلم میں ہوتے ہوئے بھی وہ تقریباً ڈیڑھ درجن گراں قدر نثری، ادبی، علمی، تنقیدی اور تحقیقی کتابیں ہم کو دے چکے ہیں۔ جو دانش گاہوں سے لے کر عوام تک مقبول ہیں۔ وہ اپنی صحرا نشینی سے بے حد مطمئن اور خوش ہیں ؂

دنیا کی محفلوں میں تنہا تھا میں
تنہائی میں کیا انجمن آرائی ہے (زمزمہ)

انھوں نے اپنے ایک انگریزی خط میں بڑا پُرمعنی جملہ لکھا ہے :-

Here I am alone, not lonely

۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور دنیا پر ایک نئی مصیبت نازل ہوئی۔ اس جنگ میں اتحادیوں کی فتح ہوئی۔ فتح کی خوشیاں منائی گئیں۔ اتحادیوں سے دلی ہمدردیوں کے باوجود مفتوحین کے مصائب اور اہانت پر آہ کا انسانی دوست دل چیخ اٹھا ؂

فاتح اک قوم شکست نشاں اک قوم
اک قوم کے گھر عید تو گریاں اک قوم

اس پست خیالی پہ بشر کی لعنت
اک قوم کی لاش پہ ہے رقصاں اک قوم

ہندوستان میں مسلم لیگ اور کانگریس میں رسہ کشی ہو رہی تھی، نیشنلسٹ مسلمان پوری طرح کانگریس کے ساتھ تھے اور مطالبۂ پاکستان کی شدت سے مخالفت کر رہے تھے۔ آہؔ کو دھکا اس وقت لگا جب تقسیم ملک کو سختی سے رد کرنے والی کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ماؤنٹ بیٹن اور ولبھ بھائی پٹیل کے دباؤ سے متفقہ طور پر پاکستان بننے کی تجویز منظور کرلی۔ سوائے مولانا آزاد کے کانگریس ورکنگ کمیٹی میں ایک ممبر بھی ایسا نہ تھا جس نے تقسیم ہند کی مخالفت کی ہو۔

ملک تقسیم ہوا، لاکھوں انسان بے وطن ہوئے، خون کی ہولی کھیلی گئی، برہنہ عورتوں کے جلوس ڈھول تاشے بجاتے ہوئے سڑکوں پر نکلے۔ حساس شاعر غصے سے تلملا اٹھا اور ایک بے حد زہریلی نظم کہی۔ لیکن اسے نوچ ڈالا۔ شائع نہیں کیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد دو واقعے آہؔ کے لیے سخت تکلیف دہ ہوئے۔ ایک تو جب پارلیمنٹ نے صرف ایک کاسٹنگ ووٹ کی اکثریت سے نام نہاد ہندی کو سرکاری زبان بنا کر اُردو پر زیادتیاں شروع کیں۔ دوسرے جب گاندھی جی کو گولی ماری گئی۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد آہؔ کو دو دن ۱۰۳ ڈگری بخار رہا اور ان پر ہذیانی کیفیت طاری رہی۔ ہوش میں آنے کے بعد پھر انھوں نے ایک تلخ نظم کہی۔ لیکن اسے نوچ ڈالا۔ اشاعت کے لیے کہیں نہیں بھیجا۔

۷۷ء کے انتخاب پر بھی آہؔ نے ایک تلخ نظم کہی۔ لیکن اسے بھی ضائع کر دیا۔ کہیں شائع نہیں کرایا۔ جو تخلیقات اُن کے انتہائی مشتعل اور غیر متوازن جذبات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور جن کے مضر اثرات سے عوام گمراہ ہو سکتے ہیں، انھیں وہ کبھی شائع نہیں کرتے۔

اب عملی طور پر آہؔ کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ نہ اخبار پڑھتے ہیں نہ اپنے گھر میں ریڈیو رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ملک میں جو برائیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کے لیے ایک بنیادی انقلاب کی ضرورت ہے

اور حالات تیزی سے اس انقلاب کی بڑھ رہے ہیں۔

حقیقتہً اس کتاب کا موضوع ہے "صفدر آہ بحیثیت شاعر" یوں تو اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب بھی ناکافی ہوگی۔ لیکن اختصار کے پیش نظر یہ جائزہ اور انتخاب اصولاً اپنے مقصد کو محیط کر لیتا ہے آنے والی نسلیں اس صحیفے کے مطالعے سے صفدر آہ کے شعری مرتبے کو کسی نہ کسی حد تک ضرور سمجھ لیں گی۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ آہ کی سرگزشت شخصیت اور حیات کے متعلق اگر کچھ مواد ان اوراق میں شامل ہو سکتا تو بہت اچھا ہوتا۔ ناگ پور میں بیٹھ کر میرے لیے یہ کام بہت دشوار تھا۔ میں نے بہت چاہا کہ آہ خود مجملاً ہی اپنے حالات درج کر دیں مگر انھوں نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ میں اپنے متعلق جھوٹ بولنے پر تیار نہیں۔ میرے مسلسل اصرار پر انھوں نے یہ رباعی لکھ بھیجی ؎

آوارا کی سرگزشت آوارا ہے
ہر کام مری عمر کا ناکارا ہے
کیا اپنی زندگی بتاؤں ہمدم
بس میں نے تمام عمر جھک مارا ہے

خوشی کی بات یہ ہے کہ آہ کی شخصیت اور حیات پر ایک کتاب کا لکھنؤ سے اعلان ہوا ہے جس پر کرشن چندر مرحوم کا پیش لفظ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اس کتاب کا انتظار کریں۔ کتاب کے مصنف گردش رضوی انگریزی ادب کے ام۔ اے ہیں۔ اور کافی دن آہ کے پاس رہ کر ان کے حالات معلوم کیے ہیں۔ میں خود اگر اس طرف توجہ کرنے کی کوشش کرتی تو کافی وقت بھی لگ جاتا اور اس کتاب کی ضخامت بھی بہت بڑھ جاتی۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آہ کی نثری تصنیفات پر بنگلور میں پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔

جس طرح انسانوں کی پستی آہ کو مشتعل اور مضمحل کر دیتی ہے اسی طرح ہر انسانی ترقی کا وہ پر جوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ جس وقت ایورسٹ کی چوٹی سر ہوئی تو وہ کہتے تھے کہ انسان نے

اوج پر جانے کے ناممکن کام کو ممکن بنا دیا ہے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد پہلا ایٹمی اسپتنک چاند کی طرف روانہ ہوا، اس وقت آہ یہ نہیں کہتے تھے کہ روس یا امریکہ چاند پر جارہا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان چاند پر جارہا ہے۔ ایورسٹ کی فتح اور چاند کی طرف اسپتنک کی روانگی یکے بعد دیگرے کے واقعات ہیں۔ آہ نے اپنی نظم "اسپتنک" میں ان دونوں عظیم کارناموں کے لئے انسان کو سراہا ہے سے

سب سے اونچے کوہ کی چوٹی پہ رکھ کر اپنے پاؤں
چھیڑ ڈالا ابن آدم نے فضا کا کہنہ راز
شکستاتی صنعت انسان فلک پیما ہوئی
جاذبہ کی رہ گئی بل کھاکے زنجیر دراز

(گلبن)

عالمگیر ایٹمی جنگ یوں تو بالکل یقینی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آہ کو انسان کی جبلی اور فطری شرافت پر اب بھی اعتماد ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانیت خود انسان کی حفاظت کرے گی۔

اعلیٰ ادبی حلقوں میں ادیب اور شاعر کی حیثیت سے آہ کا ایک بلند مقام ہے، لیکن اپنی علالت، کم نویسی اور ادبی سیاست سے علاحدگی کی وجہ سے ان کا ذکر روز کے ادبی مباحثوں میں کم آتا ہے آہ اپنی اس حیثیت سے بالکل مطمئن اور خوش ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اشتہاری دوا نہیں ہوں جس کا ذکر اخباروں اور رسالوں میں روز آتا ہے۔

آہ دل کے مریض ہیں۔ وہ جنگل میں ایک مختصر سے کتب خانے کے ساتھ سترہ سال سے تن تنہا مقیم ہیں۔ ایک ملازمہ سویرے شام آکر صرف ضروری کام کر دیتی ہے۔ آہ دن بھر میں بہ مشکل سو گرام غذا کھاتے ہیں، جو ان کے ایک گجراتی دوست بابو بھائی تیار کر دا دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں سوا گوشت کے ہر چیز کھاتا ہوں، اور سوائے شراب کے ہر چیز پیتا ہوں۔ لیکن اپنی مقدار بھر"۔ سال میں ایک مہینہ وہ موں

اور اعتکاف میں گزارتے ہیں۔ یوگ کو وہ ایک سائنس مانتے ہیں اور اس میں انھیں کافی دخل ہے۔

ان کے صاحبزادے انسر آرٹسٹ جے جے اسکول آف آرٹس کے سند یافتہ صاحب طرز فن کار ہیں۔ ایک ہی اولاد ہونے کی وجہ سے آہ ان سے بیحد مانوس ہیں۔ وہ اپنے پوتے تاجور اور پوتی رتانہ کو بھی بہت چاہتے ہیں۔ لیکن چھ سال سے ان لوگوں سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ انسر بنارس میں ہیں اور آہ گینشوری کے جنگل میں۔ باپ بیٹے میں کبھی کبھی مراسلت سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

بظاہر آہ کی زندگی آسان زیستن ایک قلندرانہ زندگی نظر آتی ہے۔ لیکن ان کی قلندری توہمات اور لایعنی اعتقادات کی تابع نہیں۔ وہ عقلیت اور سائنس کو مانتے ہیں اور انھیں زاویوں سے حیات کو دیکھتے ہیں۔ میری نظر میں وہ ایک ایسے فلسفی ہیں جس نے زندگی کے معنی سمجھ لئے ہیں۔ کریم سلک کے رنگ کا کرتا اور اسی رنگ کی تہمت پہنے، آنکھوں پر ایک موٹا سا چشمہ لگائے ایک نحیف الجثہ بزرگ اپنے گھر میں موٹی موٹی کتابوں پر جھکے ہوئے، یا کچھ لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گرد و پیش کے سارے لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن ان سے مخاطب ہونے کی ہمت بہت کم لوگ کرتے ہیں۔

چند سال قبل آہ کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ مقامی معالج ڈاکٹر راوت نے ہر تدبیر کرنے کے بعد اظہار مایوسی کر دیا۔ یہ خبر عام ہوتے ہی تھوڑی دیر میں آہ کے مکان کا برآمدہ مقامی لوگوں سے بھر گیا۔ بعض لوگ چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ آہ کہتے ہیں کہ میں اُس وقت بول نہیں سکتا تھا۔ لیکن حواس اور حافظہ باقی تھے۔ ان ہمدردی بھری رونے کی آوازوں پر سعدی کا یہ قطعہ بار بار میرے ذہن میں اُبھر رہا تھا اور دل کو بڑی تسکین مل رہی تھی ؎

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو   ہمہ خنداں بدند و تو گریاں
آں چناں زی کہ وقتِ مردنِ تو   ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

بھونڈی کے فسادات کے زمانے میں دس پندرہ میل کے حلقے میں آہ واحد مسلمان رہتے تھے۔ وہ بلا تامل ہر طرف آتے جاتے تھے۔ لیکن اُن کی طرف کسی نے انگلی بھی نہیں اُٹھائی۔

آہ کو جب مہاراشٹر گورنمنٹ نے اُن کی کتاب "میر اور میریات" پر اعزاز سے نوازا تو

گنیش پوری میں تین چار ہزار آدمیوں کے مجمع نے ان کو مبارک باد دی۔

اس بار میں نے آہ سے پوچھا کہ یہاں کے لوگ جو آپ کے مقام اور ادب کو مطلق نہیں سمجھ سکتے آپکا اتنا احترام کیوں کرتے ہیں؟ آہ نے جواب دیا کہ شاید دو وجہوں سے۔ اوّل یہ کہ میں اگر کسی کی بھلائی نہیں کر سکتا تو کم سے کم یہ کوشش تو ضرور کرتا ہوں کہ میرے ہاتھ سے کسی کی برائی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ میں مقامی سیاست سے بالکل الگ رہتا ہوں۔

اس بے لوث زندگی کے باوجود آہ ایک رجعت پسند کو ڈانٹ کر کہہ رہے تھے۔

I was a revolutionary, I am a revolutionary and I will die as a revolutionary

آہ میں ایک عجیب بات ہے کہ خیالات کا اختلاف ان کے یہاں مانع دوستی نہیں ہوتا۔ ان کے ایک بے حد عزیز دوست گپتا جی ہیں۔ جن کا ایک بنگلہ بھی گنیش پوری میں ہے۔ وہ ہر اتوار کو گنیش پوری میں ضرور آتے ہیں۔ گپتا جی کے خیالات جن سنگھ اور آر ایس ایس کے تابع ہیں۔ لیکن آہ سے وہ دل سے محبت کرتے ہیں اور کبھی کبھی آہ کے لئے تحفے بھی لاتے ہیں۔ ہر اتوار کو آہ گھنٹہ بھر اُن کے ساتھ ضرور بیٹھتے ہیں۔

ایک دن ایک مولانا آہ سے کہنے لگے کہ سچ کہیئے یہ ہندوؤں کا عقیدہ تناسخ کتنا لغو ہے۔ آہ کہنے لگے۔ بالکل بجا ہے۔ لیکن تناسخ تو آپ کے یہاں بھی ہے۔ مولانا بگڑ بولے لاحول ولا قوت آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آہ نے جواب دیا کہ مولانا ہندو بیل یا راجا بن کر جنم لے گا اور آپ حور کے شوہر بن کر پیدا ہوں گے۔ پھر آہ نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں مولانا کو سمجھایا کہ یہ انسان کی خواہشِ ابدیت ہے جو اُس کو اپنا نقطۂ اختتام قبول نہیں کرنے دیتی۔ کہیں وہ جسم بہ جسم سفر کرتا ہوا تناسخ کے راستے پر رواں دواں ہے اور کہیں جنّت میں کسی حور کا شوہر بن کر ابدی زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

آہ بیماری اور ضعیفی کی وجہ سے نہ تو زندگی سے بیزار ہیں اور خواہ مخواہ زندہ رہنے کے آرزو مند ہیں۔ وہ نہ ماضی کے مرثیہ خواں ہیں نہ مستقبل سے اُن کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ موت سے اتنی بے خوفی اور بے پروائی میں نے شاذ ہی کسی میں دیکھی ہے۔ وہ "موتوا قبل ان تموتو" کے صحیح مصداق بنے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔

ایک دن میں نے کہا کہ آپ کی کتابیں "نو بہ نو"، "ہندوستانی ڈراما"، "میر اور میریات" اور "تلسی داس اور رام چرت مانس"، ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ وہ ہنس کر کہنے لگے، کہ جو چیز تخلیق ہوئی ہے اس کو ہمیشگی سے کوئی تعلق نہیں۔ جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ موت اور فنا کے منہ میں جا رہا ہے۔ میری کتابیں، جواہر لال، گاندھی، لینن اور کارل مارکس

سب کا اسمی وجود بھی فنا ہونے والا ہے۔ کوئی دس برس میں فنا ہوگا۔ کوئی سو برس میں۔ کوئی ہزار برس میں اور کوئی پانچ ہزار برس میں۔ لیکن نقطۂ آخر ہر بننے والی چیز کا انتظار کر رہا ہے۔ پھر دس سال اور پانچ ہزار سال کے فرق پر خوش ہونا کیا؟ زماں ایک فرضی واہمہ کی چیز ہے۔ اس کے دس اور پانچ ہزار سال میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

سچ مچ آپ علم کے ایک دریائے ذخار ہیں۔ ابھی وہ معتزلہ اور اشاعرہ پر گفتگو کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ گفتگو ویدانت اور جیوتش پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد اضافیت کے $E = MC^2$ کی تشریح بیان ہونے لگی۔ موڈ بدلا تو شعر و شاعری شروع ہو گئی۔ وہ شعر تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں۔ لیکن ان کی زبان سے اُردو، فارسی، ہندی اشعار سن کر اُن کا نیا مفہوم اور نئے معنی ذہن میں آنے لگتے ہیں۔

مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۷۸ء

زرینہ ثانی۔ ناگپور

انتخاب مجموعہ نمبر ۱

زمزمہ

رباعیات

دوسرا ایڈیشن

یہ خیال بالکل درست ہے کہ پاکستان میں جوشؔ اور ہندوستان میں آہؔ رباعی نگاری میں منفرد عہد ہیں۔ زمزمہ اُس وقت شائع ہوا جب آہؔ صحرانشین ہو چکے تھے۔ لیکن ہند و پاک کے مؤقر جرائد نے متفقہ طور پر زمزمہ کو بے مثل قرار دیا۔ خاص کر اس مجموعے میں صنفِ رباعی کے ڈرامے "عقل کی شکست" کو اس صنف میں ایک

میں ایک نیا قدم اور لاجواب کارنامہ
سمجھا گیا۔

جوشؔ کی رباعیوں کے بعد زمزمہ
انقلابی خیالات حکیمانہ فکر اور
رنگا رنگ انداز بیان کا
سدا بہار گلدستہ
سمجھا گیا

کچھ اور ہوا ہے غیب ظاہر ہو کر
مومن یہ دل بنا ہے کافر ہو کر
اب تک اوہام کو سمجھتا تھا خدا
عارف میں ہوا ہوں آہ منکر ہو کر

تصدیق تو ہو عشق کے افسانوں کی
تسکین بھی کر دیجیے دیوانوں کی
کب تک یہ زاہدوں کے حجروں کا طواف
محفل میں ذرا آئیے انسانوں کی

یہ فکر تری ہے واہمہ یعنی نہیں
اس فکر کا ہے عکس خدا یعنی نہیں
"ہو" جوہر ماصل جس کا حاصل ہی نفی
عرفان کی انتہا ہے "لا" یعنی نہیں

اک زاہدوں کی، رندوں کی اک ملّت ہے
دونوں کی الگ الگ مگر صورت ہے
زاہد کا خدا ہے دیوِ خوفِ دوزخ
رندوں کا خدا تبسّمِ رحمت ہے

یا ربِّ جمیل! نورِ محفل تو ہے
ہر ناز کے راستے کی منزل تو ہے
خم ہو گئی ہم حسن پرستوں کی جبیں
جس وقت سنا کہ حسنِ کامل تو ہے

سوتے سے مشیّت کو جگایا ہم نے
بن کر "فیکون" "کُن" کو اُٹھایا ہم نے
اللہ نے پیدا کیا ہم کو لیکن
اللہ کو اللہ بنایا ہم نے

اک قلزمِ بے خروش بننا ہو گا
اک نورِ سیاہ پوش بننا ہو گا
افسوس ہے اے آہ یہ معلوم نہ تھا
گل ریز کو گل فروش بننا ہو گا

ہر چند کہ میں نے غل مچایا، میں کون؟
لیکن نہ کسی نے یہ بتایا، میں کون؟
خود اپنی ہی بازگشت آواز سُنی
"میں کون" صدا، جواب آیا "میں کون"؟

میں ہی اوّل ہوں اور آخر ہوں میں
حدِ میری بصر ہے بحرِ وافر ہوں میں
جو پیشِ نظر نہیں وہ سب مجھ میں ہے
مرکزِ نظر کا صرف مناظر ہوں میں

کل ہیں تو نہ ہوں گا میری راہیں ہوں گی
ذرّوں میں چھپی، یہی نگاہیں ہوں گی
میرا ہی تو خون اُن میں رقصاں ہوگا
گردن میں حسینوں کے جو باہیں ہوں گی

بے کار محبت سے بہت ڈرتا ہوں
لوگوں کی عقیدت سے بہت ڈرتا ہوں
بدبینیٔ یاراں کا نہیں غم لیکن
الزامِ شرافت سے بہت ڈرتا ہوں

تو اور مصیبتوں میں اے آہ اسیر!
زنجیرِ سراب میں اک آگاہ اسیر
تیری یہ قیدِ غم ہے بالکل ایسی
جیسے ہو خواب میں شہنشاہ اسیر

دیکھا اک آدمی کراہت بالذّات
سہما سہما ہوا، اسیرِ خدشات
لعنت اس پر، یہ کون؟ یہ تو میں ہوں
توبہ ہے ارے تجربۂ سیرِ حیات

یہ مان لیا کہ ہوں میں، اور بے شک ہوں
لیکن کب سے ہوں؟ کیا ہوں؟ اور کب تک ہوں
آیا ہوں کہاں سے؟ اور جانا ہے کہاں؟
سالک ہوں کسی رہ کا کہ خود مسلک ہوں؟

کل رات کو گلشن میں لئے شمعِ شعور
میں ڈھونڈ رہا تھا کوئی رازِ مستور
مرجھائے ہوئے پھول کہہ گئے رمزِ حیات
غنچے یہ چٹک کے بولے "تسلیم حضور"

باقی نہ دوئی کا کوئی پہلو رہ جائے
یہ دیر و حرم مٹ کے فقط 'ہو' رہ جائے
پردہ جو حقیقت سے اُٹھا دوں اے دوست
یں میں نہ رہوں اور نہ تو، تو رہ جائے

یہ ظاہر و باطن ہیں سمجھ لو بحرین
لیکن ہے بڑا فرق ان کے ما بین
ظاہر مرا کونین کا اک ذرّہ ہے
باطن میں مرے ذرّے سے کمتر کونین

بے یار و ندیم ہوں اکیلا تنہا
گذری ہے تمام عمر تنہا تنہا
انسانوں کے ریل پیل اس میلے میں
تنہا میں کھڑا ہوں اور کتنا تنہا

اس روح کو تسکین کا ساماں نہ ملا
فانوس کسی دل کا فروزاں نہ ملا
مجمع میں بھٹکتا رہا انسانوں کے
افسوس ہے لیکن کوئی انساں نہ ملا

مطرب کے سوزِ دل کا غمّاز ہوں میں
جو وقت کے ہاتھ میں ہے وہ ساز ہوں میں
میرے لفظوں میں بولتا ہے مرا عہد
ماحول کی اپنے آہ آواز ہوں میں

ہم نے تاریکیوں سے کی ہے پیکار
ہم نے ہر ہر قدم پہ جھیلے آزار
پہنچا کے کارواں کو تا منزلِ صبح
رخصت ہوتے ہیں شب کے مشعل بردار

کرتی ہے حیات آپ سامانِ حیات
ہل آج چلا رہا ہے دہقانِ حیات
فردا کا ہو رہا ہے کارِ تعمیر
کل جھوم اٹھیں گے گندمستانِ حیات

قانونِ ارتقا ہے ساری اب تک
باقی ہے کرب و بے قراری اب تک
پس پس کر آہ کتنی شکلیں بدلیں
تخلیق کا سلسلہ ہے جاری اب تک

فطرت نے کہا کہ کیوں رے ابنِ آدم
گھبرا گیا زلفیں جو ذرا کیں برہم
ہوتا ہے یہی سنگار کرنے سے قبل
لے دیکھ کہ بن سنور کے آ پہنچے ہم

غمّازی کو ستی ہے چُپ رہنے کو
جیحون ہیں قطروں سے ابھی بہنے کو
بالغ نہیں انساں کا تعقّل ورنہ
ہر ذرّہ ہمک رہا ہے کچھ کہنے کو

عالم کا کج کلاہ فغفورِ فلک
عزم تسخیر کی جبیں پر ہے جھلک
کم مایہ ہے انسان؟ عیاذاً باللہ
یہ جنس خدا نما ہے مسجودِ ملک

ہر سمت سے رونے کی صدا آتی ہے
انسان پہ مُردنی سی لہراتی ہے
جس مُنہ کے پاس آہ جاتی ہے خوشی
آنکھوں میں نمی دیکھ کے ڈر جاتی ہے

دل تنگ نہ ہو وقت اگر ہے سر ہنگ
فردا کے جواہر ہیں یہ امروز کے سنگ
اِن سوکھی ہوئی خزاں زدہ شاخوں میں
انگڑائیاں لے رہا ہے پھولوں کا رنگ

معراج پہ انسان کی قسمت ہو گی
دنیا میں عوام کی حکومت ہوگی
کل تک تو فلک پر تھا مقامِ جنّت
اب ساری زمین باغِ جنّت ہو گی

بہ زعم ہمہ دانی و جاہل انساں
پُر کینہ و بیگانۂ منزل انساں
تہذیب کی تاریخ میں یہ بھی لکھ دو
خود اپنے بنی نوع کا قاتل انساں

اجمال میں لا رہا ہوں تفسیریں میں
دل بہلے وہ کر رہا ہوں تدبیریں میں
اشکوں کے خطوط دے کے آڑے ترچھے
ماضی کی بنا رہا ہوں تصویریں میں

عصیاں کو وہ قہرِ خدا کہتے ہیں
عاصی مجھے کہہ کے بُرا کہتے ہیں
کچھ عقل میں آتا نہیں کیا شے ہے گناہ
سمجھاؤ تو سب لوگ یہ کیا کہتے ہیں

تذلیل ہے یہ خوف سے سجدا کرنا
پھر نا رندی سے عہدِ تقوا کرنا
ہو مبطلِ شوق نارِ دوزخ کا خیال
کتنی بڑی بُزدلی ہے توبا کرنا

ہاتھوں میں ذرا جامِ خوشی لینے دے
جی بھر کے شرابِ عیش پی لینے دے
اس ہولِ اجل کے ساتھ کیا لطفِ حیات
ہاں، مرنا ہے کل تو آج جی لینے دے

یہ نرم ہوا اور سہانی یہ بھور
دریائے جمالِ سحری کا یہ زور
دو چار خوشی کی اور سانسیں لے لے
آ پہنچی قضا لئے اندھیرا گھنگھور

گرنا پڑنا ہے، ٹھوکریں کھانا ہے
حمّال کو بوجھ اپنا پہنچانا ہے
ماضی نے جو گٹھریاں ہیں لادی مجھ پر
فردا کے حضور اُن کو لے جانا ہے

اونچے یہ کوہ، اور یہ پستی میری
مبہوت کھڑی ہے خود پرستی میری
دنیا کے ان وسیع میدانوں میں
جیسے رینگ رہی ہے ہستی میری

آنکھوں میں ہیں اشک اور تعب نامعلوم
توجیہ غم و نالۂ شب نامعلوم
ظاہر معلول ہے اور علّت غائب
اک شور تو سنتے ہیں سبب نامعلوم

رقصاں ہر وقت سر پہ تلواریں ہیں
شفّاف ہیں پھل، سان چڑھی دھاریں ہیں
مالک میرے، اسی کو کہتے ہیں حیات
ہر سانس میں اژدروں کی پھنکاریں ہیں

ہاں کھو جا، اگر عیش میں کھو سکتا ہے
فکرِ فردا کو دھو، جو دھو سکتا ہے
معشوق ہے آغوش میں دل میں ہے شباب
کر لے جو کچھ کہ آج ہو سکتا ہے

مٹی میں کہ سوئے آسماں جانا ہے
جائیں گے وہیں سب کو جہاں جانا ہے
اے ساقیِ لالہ فام، بھر دے مرا جام
کس کو معلوم ہے کہاں جانا ہے

بے فکری فکر کے لئے ہے آزار
راس آتی ہے ذہن کو ہوائے ادبار
کھلتے ہیں مصیبتوں میں تخلیق کے پھول
آرام حقیقت میں ہے مرگِ فن کار

ہیجان ہر اک ہے دل ہلانے والا
انسان نہیں نجات پانے والا
دم بھر ہے سکون بعدِ طوفاں اے دل
پھر دوسرا طوفان ہے آنے والا

بگڑا ہوا انساں ہے سنورنے والا
تہذیب کا حسن ہے نکھرنے والا
اس آج کی پستی سے نہ بددل ہونا
اک کوہِ عروج ہے اُبھرنے والا

یہ سیلِ زمانہ کا تلاطم توبہ!
یہ لیل و نہار کا تصادم توبہ!
اس محشرِ زندگی کے ہنگاموں میں
انساں! ترے ہونٹوں کا تبسم توبہ!

اک سازِ سکوں ہے لطفِ یکتائی ہے
عزلت کی بہار مجھ کو راس آئی ہے
دنیا کی محفلوں میں تنہا تھا میں
تنہائی میں کیا انجمن آرائی ہے

آگاہ ہوا کذبِ دل آرائی سے
ہوش آیا فریب کھا کے رعنائی سے
میں محفلِ صد رنگِ جہاں بھول گیا
جب ربط بڑھا شاہدِ تنہائی سے

حکمت کے مشغلے وہ موقوف ہوئے
دھوکا دینے میں دل کے مصروف ہوئے
اب روزے نماز میں گزرتا ہے وقت
یعنی کہ دماغ و عقل ماؤف ہوئے

بے چارہ دُکھا ہوا ہے، دل کو نہ ٹٹول
رِستے ہوئے زخم ہیں، اسے ان کو نہ کھول
ویران پڑا ہوا ہے صحرائے حیات
رَم کرتے نکل گئے غزالوں کے غول

ملتی تھی نظر، نظر سے دل جاتے تھے
پہلو میں حسین آ کے کھل جاتے تھے
منہ پھیر کے وہ آج نکل جاتے ہیں
کل تک جو گلے دوڑ کے مِل جاتے تھے

اے عمر، تری لگیں بیٹھیں کب تک
مُردہ ماضی کا یہ گھسیٹیں کب تک
یوں ہم پہ حسین مرتے تھے، یوں مرتے تھے
ہانکو گے بڑے میاں، یہ ڈینگیں کب تک

دل اپنا عبادت میں لگاتے ہیں حضور
تسکین کے راستے بناتے ہیں حضور
جب تھوک دیا بتوں نے کھوسٹ منہ پر
تو پیش خدا پلٹ کے جاتے ہیں حضور

کیا سے یہ کیا ہوا، نہ کچھ جان سکا
یہ میں ہوں، کسی طرح نہ دل مان سکا
کل آئینہ دیکھا تو یقیں کر ہمدم
میں خود کو بمشکل کہیں پہچان سکا

یہ دَور بہت بُرا ہے، ہاں مانتے ہیں
قسمِ گُل سے کلی کو اب جانتے ہیں
اس عمر پہ لعنت کہ حسینوں کو آج
ہم ان کے خد و خال سے پہچانتے ہیں

بد سے بد تر ہے ہر مہینہ، ہر سال
ہر ہستی کو لحظہ لحظہ ہے زوال
اے عمر! ابھی تو حُسن آتا ہے نظر
کل ضعفِ بصر سے ہوگا دیدار محال

دل شعر و شاعری کا شیدائی ہے
روز و شب اب بھی فکر پیمائی ہے
بس رنگِ سخن میں یہ ہوئی تبدیلی
رعنائی تھی پہلے، آج بینائی ہے

مدّت سے کھُلا ہوا ہے بابِ تقویٰ
ہاں سُن لیا، سُن لیا نوابِ تقویٰ
کونین کی تسخیر کا جاگا ہے عزم
بس بند بھی کیجے یہ کتابِ تقویٰ

یہ ظلم کا دور اب رہے ناممکن
بدلیں گے عنقریب یہ رات، یہ دن
انسانوں کی اِس فاقہ کشی کے پیچھے
چنگھاڑ رہا ہے، سُن بغاوت کا جِن

ہشیار! دہل بجتا ہے، رن پڑتا ہے
اب چہرِ امارت میں گہن پڑتا ہے
جس سونے کے ڈھیر میں ہے بھوکوں کی قبر
اُس سونے پہ فولاد کا گھن پڑتا ہے

ذلّت کا کلنک ہے نگوں سر کے لئے
تاجِ اعزاز ہے بہادر کے لئے
ٹکراؤ اس سر سے نظمِ عالم پر مار
یہ سر نہیں جوتیوں کی ٹھوکر کے لئے

تم اپنے ہدف پہ مثلِ ناوک پہنچو
طے راہ کرو تا حدِ مسلک پہنچو
بے شک یہ نبیؐ تمہیں خدا تک لائے
اب اور بڑھو آگے کہ خود تک پہنچو

ناپختہ و مغزِ خام انداز بیاں
شمشیر زباں تیز ہے دل ہے ترساں
کچھ جوشِ عمل سے دے شجاعت کا ثبوت
اے پیر بہ ہمّت و جوانی بہ زباں

کچھ دھاریں نکل رہی ہیں اُلٹی سیدھی
کچھ موجیں مچل رہی ہیں اُلٹی سیدھی
اِس وہم کدے کو خاک سمجھے انساں
پرچھائیاں چل رہی ہیں اُلٹی سیدھی

اک عمر کے بعد میں نے اتنا جانا
ناداں ہے یہاں کوئی، نہ ہے فرزانا
مدہوش ہے اپنی سادگی میں احمق
سرمست ہے اپنی اینڈ آن میں دانا

دو اہلِ بصیرت میں خیالوں کا تضاد
نکتے جھُولے ہوئے دلاتا ہے یاد
لیکن جہلا میں جو ہوا رائے کا فرق
ذرّے ذرّے سے پھُوٹ پڑتا ہے فساد

مبہم تھے حقیقت و مجازِ ہستی
اب آیا سمجھ میں مری رازِ ہستی
آواز ہو قہقہے کی یا نالۂ غم
یہ دونوں ہیں نغمہائے سازِ ہستی

بیگانۂ منزل و وطن آوارا ہے
کاندھے پہ مصیبتوں کا پشتارا ہے
ماضی کے کھنڈر ہیں پیچھے تا حدِ نظر
اور آگے گھٹا ٹوپ اندھیارا ہے

گل جلوہ نمائے صد بہاراں ہوں گے
شاخوں پہ طیور آ کے غزل خواں ہوں گے
اس چھوٹے سے بیج کو حقارت سے نہ دیکھ
اس بیج سے گلزار نمایاں ہوں گے

مخمورانا مجو خودی بنتا ہے
شیطاں خصلت اک آدمی بنتا ہے
جب لاکھ غریب مٹ کے ہوتے ہیں تباہ
تب جاکر ایک لکھ پتی بنتا ہے

ننگوں کی بیچ کر لنگوٹی کھائیں
بھوکوں کے بدن کی بوٹی بوٹی کھائیں
وہ گرگ سرشت ہیں یہ دولت والے
انسان کے خون کے ساتھ روٹی کھائیں

بے خواب ہے بستر پہ امیر مغرور
چٹان پہ سو رہا ہے تن کر مزدور
دولت ہے اُدھر مگر نہیں ہے دل کو سکوں
غربت ہے اِدھر مگر ہے رسیا مخمور

میلوں کی حدوں میں گڑگڑاتے ہوئے مل
قتّال صفت سیٹی بجاتے ہوئے مل
مزدوروں کی ہڈّیوں کا ایندھن کھا کر
چلتے ہیں یہ سب دھواں اُڑاتے ہوئے مل

اسبابِ تعیّش کا سفینہ آیا
انسان کو رہنے کا قرینہ آیا
پوچھا میں نے جو عیشِ عالم کا سبب
مزدور کے ماتھے پہ پسینہ آیا

زروالے پکارے ہم "خدائے دوراں"
ایمان فروش بولے "ہاں بے شک ہاں"
شیطان نے انسان کو سجدہ نہ کیا
شیطان کو کر رہا ہے سجدے انساں

فردوسِ بریں میں تھے مقیّد آدم
با سلسلۂ نسل لاحد آدم
اِس گلشنِ ہستی میں بہاریں لایا
بس ایک گناہِ جدّ امجد آدم

ہر بات کو سچ مان لے، ہر بات کو حق
شک دل میں کہیں سے نہ ہو پیدا مطلق
اتنا ہی جنّتی ہے، جتنا بے عقل
لکھا ہے درِ اِرم پہ "بیت الاحمق"

ہم رند منش مست طبیعت والے
یہ حور و قصور کی بشارت والے
دقیانوسوں سے آہ بے کار ہے بحث
چھوڑ و انھیں، یہ لوگ ہیں جنّت والے

ہے آگ چھپی ہوئی تہِ دُود سمجھ
کچھ دل کو بشر کے مرے معبود سمجھ
انسان کو مجبور بنانے والے
مجبور کا مقدور بھی محدود سمجھ

تکمیلِ مطالباتِ فطرت ہے گناہ
دل کے لئے تحصیلِ سعادت ہے گناہ
قانون و رواج کیسے دنیا کے ہیں
توبہ توبہ، یہاں محبت ہے گناہ

کیا جانیں جناب شیخ لذّاتِ گناہ
گمراہ مجھے کہتے ہیں خود ہیں گمراہ
توبہ کر لوں گناہ کرنے سے میں
لاحول ولا قوۃ الّا باللہ

ذرّوں کو جو یک جا کرو صحرا ہو جائے
صحرا کو بانٹ دو تو ذرّا ہو جائے
تقسیم سے دریا کے بنا ہے قطرہ
قطروں کو کرو جمع تو دریا ہو جائے

تسبیح بنا منسلکہ دانوں کی
جوشِ تفریق یہ ہوُ ہے دیوانوں کی
تو نام پہ توحید کے اے مشرکِ عمل
توحید مٹا رہا ہے انسانوں کی

انداز طرب شان دل آرائی ہے
جاں بخش عجب مژدۂ نو لائی ہے
جی چاہتا ہے جان تصدق کر دوں
یہ کتنی حسین ہو کے قضا آئی ہے

اک خشت سرِ راہ نظر آئی مجھے
گھبرائی وہ کچھ سمجھ کے سودائی مجھے
کہنے لگی میں شاہجہاں کا ہوں محل
تقدیر کشاں کشاں یہاں لائی مجھے

مشرق مغرب کہیں یہ گورے کالے
عفریت کھڑے ہوئے ہیں تانے بھالے
افراتفری میں اس تمدن کی آہ
انسان کو جینے کے پڑے ہیں لالے

خوش باشی رہ گئی نہ وہ خوش فہمی
روحِ انساں ہے جیسے سہمی سہمی
گلزارِ دنیا کے خزاں چھائی ہے
اے آہ کہاں گئی وہ گہما گہمی

آئینِ زندگی سکھاتا ہوں میں
حکمت کی رباعیاں سُناتا ہوں میں
اے راہِ شباب سے گزرنے والو
دیکھا جو کچھ ہے وہ بتاتا ہوں میں

فاتح اک قوم شکست ساماں اک قوم
اک قوم کے گھر عید تو گریاں اک قوم
اِس پست خیالی پہ بشر کی لعنت
اک قوم کی لاش پر ہے رقصاں اک قوم

اندازِ غزل طرزِ مسدس آ جا
پژمردہ شباب لے کے نورس آ جا
روٹھے ہوئے دلدار کی آج آمد ہے
اے عمرِ گریزاں مری واپس آ جا

مخمور نگاہ زلف مہکی مہکی
اور آگ یہ حسنِ نو کی دہکی دہکی
بھینی بھینی ہے مے کی خوشبو منہ میں
بے باک ادائیں چال بہکی بہکی

ہلکا ہلکا کہیں یہ بو جھل نغمہ
نغمہ نغمہ اور اک مسلسل نغمہ

دونوں ابرو غزل کے دو مصرعے ہیں
اُن کی صورت ہے اک مشکل نغمہ

اللہ رے محبّت کا جہان خاموش
روداد طویل اور بیان خاموش
ساکت بیٹھا ہوا ہے سُننے والا
کہتی جاتی ہے کچھ زبان خاموش

پیمانۂ عیش کاش چھلکا ہوتا
اور سر سے دوپٹّہ ترے ڈھلکا ہوتا
سائے میں تری زلف کے کٹ جاتی رات
یوں کاش سویرے کا دھندلکا ہوتا

وعدہ کوئی جس وقت وہ فرماتے ہیں
دل محوِ فریبِ صوت ہو جاتے ہیں
طے ہے کہ محال اُن کا آنا ہے مگر
یوں بیٹھا ہوا ہوں، جیسے وہ آتے ہیں

وعدہ یہ تھا کہ وقتِ شب آئیں گے
اللہ، مرے گھر میں وہ کب آئیں گے
ہر ضرب یہ کہہ رہی ہے دل کی دھڑکن
اب آئیں گے، اب آئیں گے، اب آئیں گے

مستی ہے عجب حسن کے مستانے میں
مے ہے کہ سماتی نہیں پیمانے میں
چلتی ہوئی پتلیاں الٰہی توبہ
اک دور سا چل رہا ہے مے خانے میں

حُسن ان کا حسین تر نظر آتا ہے
رازِ گردوں جبیں پہ لکھ جاتا ہے
ہے جامِ شراب میں ستاروں کا عکس
اور عکسِ شراب مُنہ پہ لہراتا ہے

کھو بیٹھے وہ خود قرار اللہ اللہ
سُن کر مرا حال زار اللہ اللہ
برساتی رہیں شراب جن کی آنکھیں
ہوتے ہیں وہ اشکبار اللہ اللہ

اس طرح وہ دل ربا دل آرا آیا
کرتا ہوا مٹنے کا اشارا آیا
ماتھے پہ لگا ہوا ستارا توبہ!
یہ بُرجِ شرف میں کون تارا آیا

ہونے لگی اب تو مری رسمی تکریم
تخصیص پہ چھا گیا ہے رنگ تعمیم
میں نے جو کہا "آپ ہیں جانِ ارماں"
وہ طنز سے مسکرا کے بولے "تسلیم"

منہ کر کے نظر سے اوٹ ہنستے ہنستے
دیتے ہیں وہ دل پہ چوٹ ہنستے ہنستے
کہتا ہوں میں جب دردِ محبت کا حال
ہو جاتے ہیں لوٹ پوٹ ہنستے ہنستے

تا جلوۂ ذات اب رسائی دے دی
احساں کیا دادِ جبہہ سائی دے دی
خود کو مری گود میں گرا کر بولے
لے بندے تجھے ساری خدائی دیدی

اک مست شباب ساتھ دل میں ہلچل
وہ گھاس ہری ہری کہ فرشِ مخمل
ہرتے بھرتے ہوئے وہ گرتے جھرنے
ہلکے پھلکے ہوائیں اُڑتے بادل

لو ڈوب گیا صبح کا تارا جاگو
پَو پھوٹ رہی ہے اب خدارا جاگو
کُمھلائے پڑے ہیں شب کے مسلے ہوئے پھول
اب صبح ہوئی ہے اے دل آرا جاگو

محرومِ وصال محوِ لذّات رہے
شبنم کی یہ شبنمی پہ برسات رہے
اے رات دراز کردے زلفیں اپنی
کچھ دیر تو یہ لطفِ ملاقات رہے

اب کھلنے لگا صبح کا رخ پیارے
پھولوں میں جھلک رہی ہے شبنم پیارے
باقی جو حیات ہے تو انشاء اللہ
کل رات کو مل بیٹھیں گے باہم پیارے

دل ہے کہ مسرّتوں کا گہوارہ ہے
گھر آیا ہوا مرے وہ مہ پارہ ہے
آنکھوں کو نہیں پلک جھپکنے کا وقت
کل عید تھی، آج عیدِ نظّارہ ہے

خاموش یہ رات سہمے سہمے بادل
یہ چاند دُھندھار دُھندھا سا تارے بوجھل
آغوش میں ہیں مری وہ کھوئے کھوئے
گستاخ ہوا اُڑا رہی ہے آنچل

شب آج لئے تازہ حیات آئی ہے
گردوں پہ کواکب کی برات آئی ہے
وہ حسنِ سراپا ہے مرے پہلو میں
اللہ اللہ! یہ کیسی رات آئی ہے

اک شوخ لئے ہوئے ہے باہوں میں گھڑا
اک ہاتھ ہے اس گھڑے میں کج ہو کے پڑا
جاگ اٹھتا ہے فتنۂ قیامت ہر گام
چلنے میں رگڑتا ہے کڑے سے جو کڑا

ہم رنگِ بہار آپ کا پنجابی سوٹ
جامہ زیبی نے کیا مچائی ہے لوٹ
کپڑے یہ ہرے ہرے، یہ گورا مکھڑا
پڑتی ہوئی ہیرے پہ زمرد کی چھوٹ

آنکھوں کی اُڑی نیند تری زار ہوا
اشکوں سے غمِ دروں کا ~~آزار~~ اظہار ہوا
آ۔ کان میں اک بات ترے کہدوں آہ
تجھکو مری جاں عشق کا آزار ہوا

پھولوں سے ہے واسطہ نہ گلزاروں سے
دل کھیل رہا ہے مرا انگاروں سے
ملتے تھے جہاں پہ روز چھپ کر ہم تم
سر پھوڑ رہا ہوں وہیں دیواروں سے

دیدار کی اُمید نہ کر کہتا ہوں
بے کار ہے رستے پہ نظر کہتا ہوں
سیلاب یہ آنسُوؤں کا بس رہنے دے
تجھ سے ہی میں اے دیدۂ تر کہتا ہوں

اے چاند! کہاں ہے وہ رجھانے والا
جنّت مری دنیا کو بنانے والا
ماہِ کامل ہوا ہلالِ شبِ وصل
آیا نہ مگر پلٹ کے آنے والا

قربت جتنی تھی اتنی دوری کر دی
کیوں لذتِ زندگی ادھوری کر دی
یہ طرزِ جفا نیا نکالا تم نے
ہر ایک تمنا مری پوری کر دی

قاتل نہ مری آرزوئے دل سمجھا
افسوس مرے قتل کو مشکل سمجھا
رونا آتا ہے اپنی قسمت پر آہ
وہ مجھ کو جفا کے بھی نہ قابل سمجھا

دل میں تمھیں رکھ لیا کہ دلدار ہو تم
اتنی سی خطا پہ اتنے بیزار ہو تم
صد پاش کیا جو میرے دل کا شیشہ
اب دیکھو اس آئینے میں سو بار ہو تم

نازک اندام خوئے جاناں نازک
ہلکی پوشاک، جیب و داماں نازک
کیا ہو گا شبِ وصال، اللہ جانے
ارماں گستاخ، جانِ ارماں نازک

لطف اور بڑھا عشق کی مے پینے میں
پیدا ہوئیں وسعتیں مرے سینے میں
جتنا جب تنا کہ دور ہوتا گیا تو
عکس اتنا ہی گہرا ہوا آئینے میں

ٹوٹا ہوا تارا ہوں خدا شاہد ہے
غرقاب کنارا ہوں خدا شاہد ہے
تم اور کسی کے ہو چکے ہو لیکن
میں اب بھی تمہارا ہوں خدا شاہد ہے

میت کے ساتھ میری کچھ دور چلے
ان نرگسی انکھڑیوں سے دو اشک ڈھلے
مٹھی بھر خاک دے کے احسان کیا
وہ خوش رہے، اللہ کرے پھولے پھلے

تلخی آنکھوں میں جیسے گھل جاتی ہے
غصّہ سے نگاہ سوئے گل جاتی ہے
اللہ رے نزاکت مزاج جاناں
چٹکے جو کلی تو آنکھ کھل جاتی ہے

یہ شغلِ غمِ عشق تو دن رات کا تھا
خوگر میں ہمیشہ انہی لذات کا تھا
کیوں آہ کیا اپنا تخلص تجویز
بس یہ بھی تقاضا مرے حالات کا تھا

آوارہ کی سرگزشت آوارا ہے
ہر کار مری عمر کا ناکارا ہے
کیا اپنی زندگی بتاؤں ہمدم
بس میں نے تمام عمر جھک مارا ہے

کل رات کو یہ آہ ادیبِ دوراں
یوں پوچھتے پھرتے تھے کسی گھر کا نشاں
تارا کے مکان کے پاس مسجد ہے کدھر؟
رہبر نے کہا کہ "وہ ہے تارا کا مکاں"

لو مجمع رنداں کی گئی رنجوری
محفل کا نکھر رہا ہے حسن صوری
بوتل بہ بغل، شعر بہ لب، چنگ بدست
آتے ہیں جناب آہ سیتا پوری

کل رات کو جبریل امیں آئے تھے
جائز ہوئی مے حکم خدا لائے تھے
میں نے جو بغور اُن کو دیکھا ساقی
بالکل تیرے ہی خال خد پائے تھے

دھیمی دھیمی فلک سے مدہوش پھوار
رِم جھم رِم جھم عروسِ باراں کا ستار
چھوٹے چھوٹے حباب مِٹتے بنتے
کھالے کھالے تڑپتی لہروں کی قطار

بَل کھاتی ہوئی ہوائیں بدلی لہکی
تھرّاتی ہوئی فضا میں بلبل چہکی
پھولوں سے لپٹ لپٹ کے مدہوش شمیم
آنگن میں چمن کے آئی، آکر مہکی

عقل کی شکست

(صنفِ رباعی میں ڈراما)

کردار

۱۔ حسینہ

ایک نوخیز حسینہ، الھڑ، ناتجربہ کار، اور جذباتی

۲۔ عقل

ایک معمّر عورت۔ چہرے پر جھُرّیاں، گورا رنگ، سفید بال
آنکھوں میں فلسفیت اور فراست۔ لہجے میں تحکّم اور
احساس برتری۔

۳۔ شباب

ایک خوب صورت نوجوان، مضبوط بازو، چوڑا سینہ، آنکھوں میں
ایک مستقل مستی اور مزاج میں ظرافت۔

(پردہ اُٹھتا ہے)

منظر:-

چاندنی رات، باغ، بہار کا موسم۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے آتے ہیں اور پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کو گدگداتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

نہر کے کنارے سنگ مرمر کے ایک تخت پر حسینہ نیم درازسی پڑی ہے۔

حسینہ (عالمِ محویت میں گنگناتے ہوئے)

یہ چاندنی رات یہ گلستاں، یہ بہار
نِکہتیں، خوشبو، فضائیں سب عنبر بار
کھوئے کھوئے سے سنسناتے ہوئے سرو
بہکی بہکی ہوائے صحنِ گلزار

حسینہ کے جذبات بیدار ہوتے ہیں اور اسے ہر چیز حسین سے حسین تر نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ایک پُراشتیاق ٹھنڈی سانس لے کر اسی انداز میں پھر گنگناتی ہے۔

گلزارِ جہاں حسین، بھر اور حسین
آغاز ہوا ہے جیسے اک دَور حسین
نس نس مری بجلیوں کا گہوارہ ہے
ہر رنگ ہے جانِ حسن، ہر طور حسین

روئیں روئیں میں گنگنانے لگا کون
دل کے پردوں میں آج گانے لگا کون
وہ سوچ رہی ہوں جو نہ سوچا تھا کبھی
نغمے یہ اَن سُنے سُنانے لگا کون!

اب شوق نہیں انجمن آرائی سے
مانوس طبیعت ہوئی تنہائی سے
اک سایہ سیہ سا آتا ہے قریب
اِس منظرِ دل کش کی گہرائی سے

کہتا ہے یہ جی کہ بس کسی کی ہو جا
سینے پہ کسی کے رکھ کے عارض سو جا
دیکھتے ہوئے اس جسم کو تسکین ملے
مضبوط کسی کے بازوؤں میں کھو جا

دفعتاً گرج کی آواز آتی ہے جو اس دل فریب سکون کو توڑ دیتی ہے جسینہ مبہم کر پلٹتی ہے۔ اسٹیج کے داہنے گوشے سے عقل غصے میں بھری ہوئی داخل ہوتی ہے۔

عقل:- (آگے بڑھ کر)

اے وائے بہ تو طفلک ناتجربہ کار
کیا تو نے کہا یہ، پھر تو کہنا اک بار
کس کے مضبوط بازوؤں کی ہے تلاش
میں بھی تو سنوں، کون ہے وہ ناہنجار

اس راہِ خطرناک پہ گر جائے گی
سچ کہتی ہوں ساری عمر پچھتائے گی
سودا یہ بہت پڑے گا تجھ کو مہنگا
سب کچھ کھوئے گی کچھ نہیں پائے گی

سنتی ہوں میں صاف ترے دل کی دھڑکن
ہاں تو نہیں بجتا ہے ترا پاگل پن
یہ جنّت آرزو، یہ خوابِ رنگیں
اعصابِ شباب کی فقط ہے اینٹھن

بھٹی یہ جوانی کی اُبلتا ہے خون
رگ رگ میں رواں دواں ہیں امواج جنون
عصیاں تجھے کھینچتے ہیں اپنی جانب
رقصاں ترے سر میں ہیں خیالات زبون

طوفان اک آیا ہے نکل جائے گا
سورج جو چڑھا ہوا ہے ڈھل جائے گا
جب شاخ سے یہ پھول گرے گا سرِ خاک
رہگیر کے تلووں سے مسل جائے گا

ہے دشمنِ آبرو تقاضائے شباب
شیطان ہے ہو بہو تقاضائے شباب
یہ توسنِ سرکش ہے اگر چھوٹی لگام
بھٹکائے گا کو بہ کو تقاضائے شباب

حسینہ سہمی ہوئی عقل کے سامنے کھڑی ہے۔ دفعتاً شباب کی پرجوش اور مست آواز آتی ہے۔ دونوں پلٹ کر دیکھتی ہیں۔ اسٹیج کے بائیں گوشے سے شباب داخل ہوتا ہے۔

شباب (عقل کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر)

بس بس اے عقل بس خدا کے لئے بس
بجز اس تری سننے کا مجھ میں نہیں کس
برسا نہ یہاں یہ بے ضرورت پانی
تجھ کو جو برسنا ہے کہیں اور برس

شباب عقل کو نکل جانے کا اشارہ کرتا ہے عقل حقارت سے شباب کو دیکھتی ہے اور اس کے قریب آکر ڈٹ جاتی ہے (شباب جوش میں پھر عقل کی طرف مخاطب ہو کر کہتا ہے

یہ مجھ کو سنا رہی تھی کیوں سخت اور سست
تیری نہ دلیل اور نہ لہجہ ہے درست
تخریب زمانے میں ہے جتنی پھیلی
"اے باد صبا، ایں ہمہ آوردۂ تست"

لذات حیات کو ترازو میں نہ تول
پُر کیف ہوا کی گرہیں چٹکی سے نہ کھول
الوان کی دل کشی کے اوزان نہ گڑھ
مت ناپ عروض سے کسی راگ کے بول

ہیں شعلۂ جوّالہ ہوں تو برف کی سِل
دل میں مرے صد کیف، ترا پھیکا سا دل
تیرے ہی جو مشورں پہ چلتی دنیا
ہو جاتی بقائے نسلِ آدم مشکل

میں رَس ہوں پھلوں کا اور پھولوں کا رنگ
جھوم اُٹھتی ہے کائنات سُن کر مرا چنگ
وہ کچھ ہی دنوں کو سہی لیکن میں ہوں
انسان کے دل کی ایک مدہوش ترنگ

ہیں میرے تقاضے تری نظروں میں جنوں
طوفان ہیں کیوں بتا یہ میرے جیجوں
اے زالِ ضعیفہ، تجھے کیا حسن سے کام
کہتا ہوں، چلی جا، نہیں ہوگی مطعوں

عقل:۔ (مٹھیاں بھینچ کر)

للکارنے والے مجھے او خانہ خراب
اے وحشیٔ بے شعور، دیوانے شباب
تکریم، نہ تعظیم، نہ عزّت، نہ سلام
سیکھے ہیں یہی چھوکرے تو نے آداب

احساس کی پیروی ہے تیرا مسلک
لذّات کا تجزیہ ہے میرا مسلک
تو مقطعِ ظلمات ہے میں مطلعِ نور
ہے شام ترا، میرا سویرا مسلک

ہیں تیری وداد وکشش کے میداں جذبات
اور ہاتھ میں رہتی ہے مرے نبضِ حیات
تو آگ لگاتا ہے، بجھاتی میں ہوں
رہزن ہے ترا وجود رہبر مری ذات

ممنون مری خود تری زیبائش ہے
میں ہوں تو یہ دل کشی کی افزائش ہے
ہوتا ابھی عالم میں وہی عہدِ حجر
دم سے میرے یہ ساری آرائش ہے

تو کیا ہے وجود کیا ہے تیرا کودک
رہتا ہے ترا دَور فقط دو دن تک
تیری ہے وہی مثال اے زود فنا
برسات میں تالاب کے جیسے مینڈک

میں ہوں میں ہوں کہ جس سے جینا سیکھے
میری ہی میری شراب پینا سیکھے
میں نے ہی میں نے بتائے اسرارِ حیات
مجھ سے مجھ سے کوئی قرینا سیکھے

تابع تو بھی مرا جو ہو جائے کہیں
سج دوں پھولوں سے تیرے گلشن کی زمیں
یہ عیب زوال تجھ سے کر دوں زائل
دائم قائم بنا دوں میں تجھ کو حسیں

عقل کی اس تحریص پر شباب زور کا قہقہہ لگاتا ہے۔ وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ اور ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہتا ہے ع "دائم قائم بنا دوں میں تجھکو حسیں"! وہ پھر ہنستا ہے اور عقل کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔

شباب:- (طنزیہ انداز میں)

بوسیدہ عنایت کی نہ گٹھڑی بخشو
مت اپنی یہ گودڑوں کی بقچی بخشو
آنے والا نہیں میں ان کھتروں میں
بخشو بخشو مجھے بڑی بی بخشو!

سوچوں، سمجھوں، نہیں یہ عادت میری
ہے فکر سے بھاگتی طبیعت میری
آتا ہے مجھے خود کو مٹانے میں مزا
دنیا سے بہت الگ ہے فطرت میری

اُٹھتا ہے جو تیز درد گاتا ہوں میں
کھلتے ہیں جو زخم مسکراتا ہوں میں
یہ جان کے بھی کہ کچھ نہیں حاصلِ عشق
دل شوخ حسینوں سے لگاتا ہوں میں

میرے لئے بربادیاں آبادی ہیں
میرے لئے ناشادیاں بھی شادی ہیں
خوش ہوتا ہوں جب چوٹ کوئی کھاتا ہوں
زلفوں کی کمندیں مجھے آزادی ہیں

ہے عیش ہی عیش میرا مشرب اے عقل
ہے لطف ہی لطف میرا مطلب اے عقل
ہے درد ہی درد بس عبادت میری
ہے عشق ہی عشق میرا مذہب اے عقل

ہاں تو نے سبک کیے ہیں مضموں بوجھل
حل کر دیے عقدہ ہائے ما لا ینحل
لیکن یہ بتا کہ دل دھڑکتا ہے کیوں
اُڑتا ہے ہوا میں جب کسی کا آنچل

اے عقل! ہوا مست بناتی ہے کیوں؟
یہ چاندنی دل میں گُدگُداتی ہے کیوں؟
الھڑ، مدہوش ایک نوخیز کی چال
ہنگامے زندگی میں لاتی ہے کیوں؟

عقل کا غصہ اور تیز ہو جاتا ہے۔ وہ جھلا کر شباب کی طرف مخاطب ہوتی ہے۔

عقل:- (تیز لہجے میں)

اے کندۂ ناتراش، ننگِ آفاق
منطق کے مباحث میں کرتا ہے مذاق
انداز ترے ذلیل، باتیں ہیں رکیک
حیوان کا ہو رہا ہے تجھ پر اطلاق

ہے تجھ سے مخاطبت کبھی تو ہین مری
کیا تجھ پہ اثر کرے گی تلقین مری
جب قعرِ مذلت میں تجھے دیکھوں گی
ہو گی اُس وقت جا کے تسکین مری

ہنگامہ نواز تیری فتنہ سازی
کرتی ہے مزاج کی ترے غمّازی
مجھ سے یہ ہنسی، کیوں ہے یہ مجھ پر چوٹیں
"بازی بازی بہ ریشِ بابا بازی"

ہیں نورِ حیات مشعلِ عالمیاں
ہاں میں نے بنا دیے پیمبر انساں
انمول نصیحتوں کے دفتر میرے
ہیں تیرے لئے فقط حدیثِ دگراں

کاندھے پہ ترے سوار شہوات کے بھُوت
منڈلاتے ہیں سر پہ ترے آفات کے بھُوت
میری آواز خاک پہنچے تجھ تک
جھنکار رہے ہیں تجھ میں لذّات کے بھُوت

آباد گھروں کو نہ زمانے کے اُجاڑ
پھولوں سے لدے ہوئے یہ پودے نہ اُکھاڑ
جس راہ پہ تو سب کو لیے جاتا ہے
اس راہ پر آفتوں کے ٹوٹیں گے پہاڑ

اے نورِ شعور کو بجھانے والے
دنیا کو غلط راہ دکھانے والے
اِس بھولی حسینہ کو نہ دے زہر کا جام
اے گلشنِ ہستی کو مٹانے والے

حسینہ کا نام سُنتے ہی شباب اس طرح بھڑک اٹھتا ہے جیسے عقل اس کی رقیب ہے۔ وہ عقل کو بڑھیا سمجھتا ہے اور حقارت سے دیکھتا ہے۔

شباب :-

اے عقلِ کہن سال کہاں ہیں ترے ہوش
آرام گہِ حسن ہے میری آغوش
کلیاں کھِل کھِل کے پھول ہو جاتی ہیں
جام اپنا بڑھا کے جب میں کہتا ہوں "بنوش"

در اصل مرا ہی ایک پرتو ہے حسن
میں نیّرِ اعظم ہوں مہ نَو ہے حسن
ممنونِ حسینانِ زمانہ ہیں مرے
میری ہی تجلّیوں کی اک ضو ہے حسن

مسلم میرا حیات ہے حسینوں کے لئے
انعام ہوں میں زہرہ جبینوں کے لئے
بڑھتی نہ کبھی حسن کی کشتی آگے
میں آبِ رواں ہوں ان سفینوں کے لئے

تیرا تو ہے شغل علم و حکمت اے عقل
پھر حسن پہ کیسی یہ عنایت اے عقل
عورت تو ہے، مگر تری باتوں سے
آتی ہے مجھے بوئے رقابت اے عقل

شباب حسینہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے۔ عقل بڑھ کر حسینہ کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیتی ہے دونوں حسینہ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شباب:۔

آ اشتیاق بہت ہے اب جدائی تیری
آ اور بڑھادوں خوشنمائی تیری

عقل:۔

اے وحشی بے شعور چل دُور الگ
بس بڑھ گئی حد سے بے حیائی تیری

شباب اور عقل میں کشمکش شروع ہوتی ہے اور ڈرامائی لہجہ تیز ہوتا ہے۔

شباب:۔

آ کیف و مسرّت ہے مرے دامن میں

عقل:۔

آ جنّتِ حکمت ہے مرے دامن میں

شباب:۔

آ کھول دوں عقدہ ہائے لذّاتِ حیات

عقل:۔

آ باغِ فراست ہے مرے دامن میں

شباب:۔ میں رازِ وجود ہوں

عقل:۔ غلط محض غلط

شباب :- میں فرحِ سعود ہوں
عقل :- غلط محض غلط
شباب :- میں لذّتِ زندگی ہوں
عقل :- یہ جھوٹ ہے جھوٹ
شباب :- ہستی کی نمود ہوں
عقل :- غلط محض غلط
شباب :- میں کیف
عقل :- نہیں
شباب :- میں جامِ صہبا ہوں
عقل :- نہیں
شباب :- میں رُوح
عقل :- نہیں
شباب :- میں ایک نغما ہوں
عقل :- نہیں
شباب :- میں لے کے حسینہ کو چلا
عقل :- تیری مجال ؟
شباب :- رستہ دے
عقل :- نہیں
شباب :- دیکھ میں جاتا ہوں

عقل:- نہیں

شباب ایک جھٹکے سے حسینہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے عقل منہ کے بھل گرتی ہے۔ حسینہ اور شباب قہقہے مارتے ہیں۔ شباب حسینہ کو گود میں اٹھا لیتا ہے۔

حسینہ:- (طنز سے)

تسلیم! ادب سے خالہ اماں تسلیم!
بس میں تو چلی، کیجیے مت حال سقیم
جب پورے پچاس کا مرا ہوگا سن
تب آپ کے حضور سے میں لوں گی تعلیم

شباب ہنستا ہے۔ حسینہ پر شوق انداز میں شباب کے گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے اور زمین پر پڑی ہوئی عقل کی طرف مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

جس چیز کی آرزو تھی وہ پا گئی میں
جس باغ میں جانا تھا وہاں آ گئی میں
باتیں تو بہت آپ کی اچھی تھیں مگر
تقصیر معاف ان سے اکتا گئی میں

ایک فتح مندانہ موسیقی کی آواز گونجنے لگتی ہے۔ اور شباب ایک شان دار انداز سے حسینہ کو اپنے ہاتھوں پر لیے ہوئے اسٹیج کے بائیں گوشے میں چلا جاتا ہے۔

عقل:۔ (سر پکڑے ہوئے زمین سے اُٹھ کر)

اُف میری شکست آج یہ میری شکست
مجھ سے یہ فساد اور یوں دست بہ دست
شیطان! ہمیری کو جیتا تو نے
پستی کا ہوا عروج، بالا ہوا پست

عقل لڑکھڑاتی ہوئی چلتی ہے

(پردہ گرتا ہے)

انتخاب مجموعہ نمبر ۳

نقش

رباعیات

پہلا ایڈیشن

اتفاق سے نقش کی اشاعت میں تاخیر ہو گئی۔ اب اس کا انتخاب ہی اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔

نقش کے آخر میں کچھ ایسی رباعیاں ہیں جن کو ہندی رباعیاں کہا گیا ہے۔ ہندی رباعی سے آہ کی مراد کیا ہے اس کی توضیح پچھلے صفحات میں دی گئی ہے۔ رباعیاں چونکہ ترانے کے نام سے گائی جاتی ہیں لہٰذا ہندی رباعیاں اس زبان میں کہی گئی ہیں جس میں اُردو شعرا گیت لکھتے ہیں۔ گیت کی زبان ہر جگہ اُردو ٹکسالی کی تابع نہیں ہوتی۔

ان ہندی رباعیوں میں ایک خصوصیت یہ بھی رکھی گئی ہے کہ ان میں عربی، فارسی کا کوئی لفظ نہیں آیا ہے۔ یہ کوشش انشاء اور آرزو سے مختلف ہے اور آہ کی قادر الکلامی کی بدیہی دلیل ہے۔

یہ کارگہہِ حیات لافانی ہے
مقصود تسلسل کی فراوانی ہے
اجزاء مرتے ہیں کلُ نہیں مرتا ہے
تو فرد نہیں ہے نسلِ انسانی ہے

مبہم یہ کائنات کھوئی کھوئی
جس کی نہ سمجھ سکا حقیقت کوئی
ہستی کا تاثّر ہے بہ اندازۂ ظرف
غنچوں کو ہنسی آئی تو شبنم روئی

شب دیدۂ عرفاں کا اُٹھا تھا پردہ
دیکھا میں نے عجیب منظر دردا
کہتا تھا کلی سے ایک مرجھایا پھُول
ماضی مرا تو ہے میں ہوں تیرا فردا

لفظوں کی نغمگی پہ سر دُھنتا ہوں
الہامِ حیات شعر میں بنتا ہوں
بیدار ہے احساسِ سماعت اتنا
کلیوں کے چٹکنے کی صدا سنتا ہوں

تخلیق گہر کرتی ہے مِٹ مِٹ کے صدف
فی الاصل ہبوط مژدۂ اوج و شرف
قانونِ ارتقا ہے بنیادِ وجود
خود موت ہے اک جستِ ترقی کی طرف

جو کچھ ہے اُس سے بچ کے جائے گا کہاں؟
کربِ ہستی سے بھاگتا ہے ناداں؟
غمزوں سے حیات کے تحفظ کا خیال
تُف تجھ پہ ہے نامحرمِ فطرتِ انساں

کوندھا اُفقِ ذہن پہ بل کھاتا ہے
میری ہی غزل دُور کوئی گاتا ہے
یہ بیتے شباب کی دھندلی تصویر
بھولا ہوا خواب جیسے یاد آتا ہے

مستقبل ہے نہ کوئی ماضیٔ حیات
مبہم ہیں نقوشِ خطِ منشیٔ حیات
ہر روز نیا ترجمہ کرتا ہے وقت
اب تک نہ معیّن ہوئے معنیِٔ حیات

کوشش ہے، عمل ہے، عزم و جد و کد ہے
تحقیق ہیں، افکار ہیں، قدح و رد ہے
انفاس کا نغمہ ہے بہت پُر معنی
زندہ ہیں تو زندگی کا کچھ مقصد ہے

مٹنے کو ثبات کہہ رہی ہے دُنیا
کیا اُلٹی بات کہہ رہی ہے دُنیا
مرتی ہے بدیہتہً جو ہر سانس کے ساتھ
اُس شے کو حیات کہہ رہی ہے دُنیا

پت جھڑ کے بعد برگِ سبز آئیں گے
گرتے ہیں جو بیج باغ بن جائیں گے
لمحہ لمحہ جہاں ہیں مرنے والے
لحظہ لحظہ حیاتِ نو پائیں گے

عادات، خیالات، مزاجِ انساں
سب ہیں متاثرِ زمانِ گزراں
یہ رُبع کرور سال کا ورثِ حیات
ہر تہہ میں لاشعور کی ہے پنہاں

اک نشتر ایک صبحِ معنی کا سروش
اک کوثر اک حکیم اک برق بدوش
یہ پانچ ہیں آفتاب اُردو کے مری
میرؔ و غالبؔ، انیسؔ و اقبالؔ و جوشؔ

احکامِ نمو کی ہو رہی ہے تعمیل
رمزِ فطرت کی ڈھونڈنا ہے تعلیل
شاعر کی کارگہہ ہے سرگرمِ کار
لفظوں میں ڈھل رہی ہے روحِ تخئیل

مفقود نیاز، جلوۂ ناز ہے گم
بہتا ہے زمزمہ مگر ساز ہے گم
اُس اوجِ منتہا پہ ہے میرا شعور
الفاظ پگھل چکے ہیں آواز ہے گم

پژمردہ ہے خزاں رسیدہ ہے خوشی
آئی تو ہے لیکن آبدیدہ ہے خوشی
ہونٹوں کے تبسم میں ہے کانٹوں کی چبھن
یہ کیسی اُداس غم گزیدہ ہے خوشی

اُمید کی شمعوں کو بجھا دیتی ہے
منزل کو بہت دُور ہٹا دیتی ہے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ آ پہنچی سحر
پھر رات اندھیرے کو بڑھا دیتی ہے

مکروہ، حسین، رحم پرور، خونخوار
تیور ہیں وقت کے انوکھے ہر بار
لمحہ لمحہ بنا رہا ہے تاریخ
صدیوں کے خرمنوں میں ہو کر انبار

ہر ساعت کے ورود و اِبطال کو دیکھ
مِٹتے بنتے ہوئے ان اشکال کو دیکھ
کتنے قرنوں کے کھا گیا ہے مُردے
اِس وقت کے کرگسِ کہن سال کو دیکھ

تاثیر نہ برجیس نہ کیوان کی ہے
کھیتی سارے عمل کے دہقان کی ہے
تقدیر کی تخلیق نہیں ہے انساں
تقدیر بنائی ہوئی انسان کی ہے

کتنی تاریک ہے یہ سنسان ڈگر
ہر گام اُلجھتی ہے اندھیرے سے نظر
تن میں گھٹ گھُٹ کے چیخ اُٹھتی ہے روح
یہ لے کے چلا ہے ذوقِ تحقیق کدھر

روز و شب کا نہ آنا جانا بدلا
اب تک نہ مصائب کا فسانا بدلا
ہم ہیں وہی غم وہی ہے رونا ہے وہی
کیونکر پھر مان لیں زمانا بدلا

اوتار، شیوخ، انبیا آتے ہیں
جو خود نہیں جانتے ہیں بتلاتے ہیں
پایانِ شبِ ظلم کسی کو نہ مِلا
باتیں کر کے سحر کی سو جاتے ہیں

اس دہر کا کج کلاہ ہونا ہے تجھے
شاہنشہِ مہر و ماہ ہونا ہے تجھے
انساں، وطنیت کی ضلالت سے نکل
کونین کا بادشاہ ہونا ہے تجھے

جلوے یہ مہ و خور کی دلآرائی کے
منظر یہ شب و روز کی رعنائی کے
بدبخت اسیرانِ بساطِ مخمل
کیا جانیں مزے بادیہ پیمائی کے

مہنگی پڑ جائے گی مسرّت تجھکو
دے گا دستِ قضا اذیّت تجھکو
اے پھول ہنسا ہے آج تو پہلے پہل
معلوم نہیں ہنسی کی قیمت تجھکو

اس پست معاشرے میں فن ہو کہ ہنر
قیمت کی لگی ہوئی ہے چِٹھی سب پر
کانٹے پہ تل رہی ہے تقدیسِ حیات
ہر شے کا ہے معیار بہ اندازۂ زر

کتنے خوابوں سے پائی تعبیرِ سحر
انوار کے لفظوں میں ہے تحریرِ سحر
نو لاکھ ستاروں کا اُجالا لے کر
تشکیل ہوا ہے خطِ تنویرِ سحر

بے چارہ بشر جی سے آیا ہے تنگ
دو سمت سے ہے بارشِ بارانِ سنگ
عقل و دانش پہ پڑ رہی ہیں چوٹیں
یزدان و اہر من میں ہوتی ہے جنگ

اچھّوں کو نہ پایا کبھی خرسند یہاں
جو نیش زنی کرے ملے قند یہاں
سونے کے تخت پر ہیں بیٹھے احمق
ہیں فرش پہ کانٹوں کے خردمند یہاں

افہام کا ہوگا نہ کبھی ختم سفر
اک صفحۂ درس ہے نیا ہر منظر
حیران بنا رہی ہے عقلِ بیدار
مبہوت کئے ہوئے ہے نیرنگِ نظر

ہر دل میں بسے ہوئے الم کو اپنا
مظلوم کو پابندِ ستم کو اپنا
ساگر سے نکلنا ہے تو ساگر کو پیر
بے غم تجھے ہونا ہے تو غم کو اپنا

کب میں نے کہا شکارِ بیداد ہوا
کب میری زباں پہ شورِ فریاد ہوا
پابندیِٔ احساسِ علائق سے چھٹا
اچھا ہوا میں خانماں برباد ہوا

مہکا مہکا ہوا خیالوں کا چمن
عرفانِ حیات کی ہیں شمعیں روشن
پیری کی مستیاں الٰہی توبہ
کچھ اور ہوئی ہے تند صہبائے کہن

لاحد کی حد کس نے پہچانی ہے
پانی ہی پانی ہے طغیانی ہے
اس بحرِ وجود میں کنارے کی تلاش
واماندہ خیالوں کی تن آسانی ہے

اوہام کے سائے میں ہے بُرہان ابھی
تشریف و فضیلت کی نہیں شان ابھی
ہنگامۂ انقلاب ہے دردِ زہ
ہے بطنِ روایات میں انسان ابھی

ذکرِ فردوس و نارِ دوزخ ہو گا
سایہ نہ خرد کا کئی فرسخ ہو گا
کس مجمعِ ابلہاں میں بھیجا یارب
اب اس سے سوا کیا ترا دوزخ ہو گا

زاہد یہ ترا نماز بازی کا ہنر
ہے عالمِ قدس کے بھی اُس پار نظر
میرا بھی ذرا سلام پہنچا دینا
اللہ میاں سے ہو ملاقات اگر

اوہام کے اوراق پہ نقّاشی ہے
پروے ہیں التقا کے اوباشی ہے
حوروں کا وصال اور یہ جنّت کا عیش
بوڑھوں کے تھکے ذہن کی عیاشی ہے

اب تک نہ گئی جہاں سے عریاں بدنی
سب کر دیکھا مگر نہ کچھ بات بنی
رستوں پہ ہیں ننگے مفلس بندے
اللہ غنی کہے جا اللہ غنی

کھولا ہے نئے عہد کا زرّیں یہ ورق
اطفالِ کہن سال کو دینا ہے سبق
"غُل کیسا ہے دیکھو تو ذرا؟" "کچھ بھی نہیں
زیرِ دیوار نعرہ زن ہیں احمق"

تقدیر کے احکام کچُل دیتے ہیں
کانٹوں کو ہٹا کے آگے چل دیتے ہیں
ہر کارِ عناصر کا پھرا کر پنجہ
ہم مرضیِ یزداں کو بدل دیتے ہیں

ہر لمحہ زمین و دوش دما دم ہلچل
تاباں رہے یہ جد و جہد کی مشعل
مجھ سے جو زندگی کے معنی پوچھو
میں تو یہ کہوں گا کہ عمل صرف عمل

ہر کور نظر بصیر و ناظر ہو جائے
ہر ہیچ وجود بحرِ وافر ہو جائے
اے آہ اگر کفر ہے علم و دانش
اللہ کرے جہان کافر ہو جائے

تخلیق کا زیر و بم یہ ایجاد کا رقص
یہ دُون یہ ارتقا کی بنیاد کا رقص
رقصِ محبوباں تو دیکھا تم نے
اب دیکھو مشینوں میں یہ فولاد کا رقص

ضحاکِ جہاں زعیم خودسر بدلیں
بار بار حکومتوں کے دفتر بدلیں
بس سمجھو ملوکیت کی آپہنچی قضا
جب سہمے ہوئے غلام تیور بدلیں

افسردہ کلی کلی ہے آزردہ بہار
چُپ چُپ ہیں طیور سُونا سُونا گلزار
اِس سے تو شبِ تار کی گُھٹن تھی بھلی
کیسی یہ رُندھی رُندھی ہے صبحِ بہار

قتل و غارت کا گرم بازار رہا
فریاد کا شور عرش کے پار رہا
گھنٹے بجتے رہے نہ جاگا بھگوان
آوازِ اذاں سے رب نہ بیدار رہا

بُجھتی ہوئی شمع چاق کر لیتا ہوں
ذکرِ وصل و فراق کر لیتا ہوں
یاد آتے ہیں جس وقت جوانی کے دن
پیری تجھ سے مذاق کر لیتا ہوں

بارے دوشیزگی نے پائی معراج
بھرپور نکھر گیا جوانی کا مزاج
باہوں میں سما کے حُسن کچھ اور ہوا
کل رات کو جو چاند تھا سورج ہے آج

شانے پہ سیاہ زلف پیچیدہ ہے
فتنہ پلکوں کے نیچے خوابیدہ ہے
ہنگامے اُٹھانے کا بھی وقت آتا ہے
دوشیزہ نظر ابھی تو دُزدیدہ ہے

دل کے آئینے پہ جلا ہے گویا
نورِ شبِ مہتاب ملا ہے گویا
اللہ اللہ یہ محبت کا داغ
اک پھول گلاب کا کھلا ہے گویا

نغمہ کو بکھیر دو جلوہ گاہوں میں
ہستی کو سمیٹتے چلو باہوں میں
کل تک محبوب تھا یہاں مستِ خرام
کرتے ہوئے رقص آؤ اِن راہوں میں

مشکیں زُلفیں ہیں اور مُکھڑا ہے گلاب
کالے بادل سے جھانکتا ہے مہتاب
ململ کے دُپٹے سے یہ چھنتا ہوا حُسن
محرم میں ہے سمٹا ہوا تابندہ شباب

سوزش سے سلگ رہے ہیں سینے کے داغ
چھلکے ہیں تمام رات آنکھوں کے ایاغ
اب کوئی نہیں آئے گا غم خانے میں
اے بادِ سحر گاہ بُجھا دے یہ چراغ

سر میں ترے پیرہن کی بُو ہوتی ہے
دل میں تیری ہی آرزو ہوتی ہے
جب سارا جہاں ہوتا ہے آلودۂ خواب
تنہائی میں تجھ سے گفتگو ہوتی ہے

خوشبوئیں اُڑا رہی ہے اللہ اللہ
غمزے دکھلا رہی ہے اللہ اللہ
اُس کے کوچے ہو کے آتی ہے صبا
اٹھلاتی آ رہی ہے اللہ اللہ

ہر سانس میں ڈس رہا ہے مہکا ہوا باغ
کرتی ہے خنک ہوا پراگندہ دماغ
یوں دیدۂ منتظر کی مژگاں پہ ہے اشک
دروازے پہ جل رہا ہو جیسے کہ چراغ

مایوس دلِ حزیں کو سمجھاؤں گا
کچھ دیر غموں کو اور بہلاؤں گا
سو جاؤ مرے رات کے ساتھی تارو
دنیا سوئی ہے میں بھی سو جاؤں گا

استادہ سرِ بام وہ مہرو ہے آج
کھولے ہوئے مشک بیز گیسو ہے آج
اس کی زلفوں سے کھیلتی تھی شاید
پہچانی ہوئی ہوا میں خوشبو ہے آج

الفاظ ہیں یا عروسِ نو سجتی ہے
آواز کھنکتی ہوئی کیا پھبتی ہے
میٹھی میٹھی اُس کی باتیں توبہ!
کانوں میں گویا بانسری بجتی ہے

رابطِ باطن ہے انصرامِ خاموش
اک دفترِ مفہوم سلامِ خاموش
معنی کے پھوٹتے ہیں جھرنے اُس وقت
دل کرتا ہے جب دل سے کلامِ خاموش

کل رات کو یہ چاند سے میں نے پوچھا
ہے تجھ سا حسین کوئی دنیا میں بنا؟
وہ بولا کہ "صرف ایک" میں نے کہا "کون؟"
جل کر کہنے لگا کہ "محبوب ترا!"

افسوس اجل بے چلی مے خانے سے
بن جائیں گے کچھ دنوں میں افسانے سے
ہم رند بلا نوش جو یاد آ جائیں
چھلکا دینا ذرا سی پیمانے سے

سوئے ہوئے گلشن کو جگاتے گزرے
سر مست بہاروں کو اٹھاتے گزرے
دنیا ہی بدل گئی ادھر کی اے آہ
ہم رند جدھر سے لڑکھڑاتے گزرے

ہے دور بہت ابھی جہنم کا عذاب
زہد و تقوا میں کیوں کروں وقت خراب
اے حرمت مے یہ وعظ کہنے والے
بس مانگ دعا کہ مجھ سے چھوٹے نہ شراب

دینے والے ادب کو سج دھج نکلیں
بانکے شاعر گلہ کے کج نکلیں
میری تو یہی دعا ہے اے ارضِ وطن
تیری مٹی سے چاند سورج نکلیں

شاعر فن کار اساتذہ اہلِ کلام
یاد آئے یہ سب اور اودھ کی اک شام
پھر وقت سمٹ کے بن گیا ایک کھنڈر
اور بولا میں لکھنؤ ہوں کر مجھ کو سلام

ٹوٹی قبروں کے پاسباں رہتے ہیں
جو عہد بنائیں وہ کہاں رہتے ہیں
اُکتا گیا لکھنؤ سے اب تو اے آہ
ماضی کے یہاں مرثیہ خواں رہتے ہیں

۳ــــ رباعیے

(۱)

یہ کیف و سرورِ صد بہاراں دیدہ
الوان رَچے ہوئے ہیں چیدہ چیدہ
سُن نغمۂ ارغنون لہراتا ہے
اک راگ ہے یہ لمحۂ نوزائیدہ

منہ اشکوں سے دھو رہا ہے آیا ہوا وقت
افسوس کہ رو رہا ہے آیا ہوا وقت
ہر ساعت نو ٹیس ہے زخمِ دل کی
نشتر سا چبھو رہا ہے آیا ہوا وقت

ہنس کھیل کے آتے ہوئے اشکال سے مل
بے خوف گرجتے ہوئے بھونچال سے مل
زالِ ماضی کے دام سے باہر آ
باہیں پھیلا دے شاہدِ حال سے مل

(۲)

آتی جاتی ہوئی بہاروں کو نہ رو
پیچھے چھوٹے ہوئے غباروں کو نہ رو
ہونے کو ہے اب نیّرِ اعظم کا ظہور
جو ڈوب چکے ہیں اُن ستاروں کو نہ رو

وہ بزمِ شبستاں کے درخشندہ گُہر
لڑتے رہے ظلمتوں سے تا قُربِ سحر
ہے نورِ صُبح میں اُجالا اُن کا
ڈوبے ہوئے تاروں کو بُھلا دیں کیونکر

ڈوبے کب تارے کب اُجالا آیا
یہ سب تھا فریبِ وقت جو کچھ دیکھا
ہے ماضی و فردا کا تعیّن فرضی
سب کچھ ہے نہ کچھ گیا نہ کچھ آئے گا

نیا تجربہ

ہر بار اُبھر رہے ہیں مبہم سے سوال
حل جن کا ہے ماورائے امکان و محال
ہاتھوں میں دیئے لئے ہوئے تحت شعور
کچھ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں انجانے خیال

کس رمز کی جستجو ہے معلوم نہیں
کس شئے کی آرزو ہے معلوم نہیں
بیگانۂ یادداشت نامحرم عقل
کیا چیز یہ رُو بہ رُو ہے معلوم نہیں

اک ضَو ہے پسِ حجاب بالائے حجاب
کالے بادل میں جس طرح ہو مہتاب
ہٹتی جاتی ہے امتیازات کی حد
مٹتی جاتی ہے راہِ عصیان و صواب

ہر گوشۂ ذہن میں مکمّل ہے سکوت
حیرت ہے تعقّل کو دلائل مبہوت
ہونے کو ہے لب کشا کوئی ساعت میں
رازِ ملکوت و جبروت و لاہوت

ہندی رُباعیاں

(اِن رباعیوں میں عربی فارسی کا کوئی لفظ نہیں ہے)

اس دیس کی یہ سب سے پیاری بولی
یہ لکھنؤ دِلّی کی سنواری بولی
ہیرے موتی سے بڑھ کے ہیں اس کے بول
داتا پھولے پھلے ہماری بولی

ہلتی ہوئی گالوں پہ یہ بالوں کی لٹ
دونوں آنکھیں ہیں جیسے رس کے پنگھٹ
اُس نے جو ہاتھ اُٹھا کے انگڑائی لی
ٹوٹیں انگیا کی گانٹھیں چٹ چٹ، چٹ چٹ

لہرا کے وہ چوڑیاں جو ہاتھوں میں ہلیں
مدھم سی جھنک میں سارے سُرُ ریج کے ملیں
اِن گوری ہتھیلیوں پہ مہندی کا رنگ
جیسے دو لال پھول مدھ بن میں کھلیں

پھولوں کی لچکتی ڈال آنچل کی لٹک
کپڑوں میں کنوارپن کی سُتھری سی مہک
کالے بالوں میں کالی ناگن کا بل
گورے مُکھڑے پہ تیرے چندا کی چمک

وہ آئے ہیں گھر میں مرے تھوڑی سی پیئے
تارے تیار ہیں بدھائی کے لئے
یوں جگمگ جگمگ ہو رہا ہے امبر
اک ساتھ جلیں جیسے کئی لاکھ دئے

رُوپ اپنا دکھاتی وہ چھما چھم آئی
پنگھٹ سے بھر کے جل جھما جھم آئی
پائل کی جھنک سے جی ہوا ڈانوا ڈول
گج گامنی البیلی چھما چھم آئی

مٹی مہکی گرج سے دھرتی دھمکی
کوئل کوکی تڑپ کے بجلی چمکی
منگھے آئے نگاڑے برکھا کے بجے
اے ری آلی باتیں کر پریتم کی

سمجھایا تھا لگا نہ یہ پریت کا روگ
برہن اب بھوگ چھوٹے کرموں کا بھوگ
تیرا تو دُکھ ہے میری آلی ایسا
گیتوں میں جو سُنا ہے رادھا کا ویوگ

کیا بات بتاؤں آج کی تجھ کو سکھی
مندر میں سویرے جو میں درشن کو گئی
دیکھا تو ٹھاکر کی مورت کی جگہ
مُسکاتا تھا کھڑا امرا پردیسی

یہ تپتا جلیٹھ یہ برستی ہوئی آگ
تو کون راستے پہ کھیلتی پھرتی ہے پھاگ
برہن کا گھر پڑا ہے سُونا سُونا
گاتے پھرتے ہیں بھونرے سارنگ کا راگ

میں رُوٹھ بھی جاتی ہوں، لاج آتی ہے
پھر بھی ہر چھیڑ ان کی بہت بھاتی ہے
رتنار ہی آنکھ سے وہ جب دیکھتے ہیں
آلی مجھے جھرجھری سی آجاتی ہے

رُوپا میں تُلی سی یہ چاندنی رات
کھیتوں پہ کھُلی کھُلی سی یہ چاندنی رات
بادل جیسے دُھل کے نکلا ہے چاند
اُجلی سی دُھلی دُھلی یہ چاندنی رات

اُوپر تاروں کا ہے سہانا سا رچاؤ
من بھاون چاندنی کا نیچے پھیلاؤ
یہ چاند یہ رات اور یہ نیلا آکاش
ساگر میں ڈولتی ہے سونے کی ناؤ

سیتل پانی بکھیر رہا ہے چندا
سونا چاندی لُٹا رہا ہے چندا
دُکھ کے مارے ہوئے ہیں دھرتی کے لوگ
سُکھ کی گنگا بہا رہا ہے چندا

بھور آئی ہٹا رات کی کالک کا نیل
سورج کی کرن ہے یا ہے سونے کی ریل
لمبی پرچھائیاں ہیں نیچی ہے جوت
اندھیارے کے بھوتوں نے بڑھایا ہے ڈیل

برکھا رس گھولتی ہے اب کیا ہوگا
پروا ڈولتی ہے اب کیا ہوگا
ساجن بن یوں ہی جل رہی تھی برہن
کوئلیا بولتی ہے اب کیا ہوگا

تن پر یہ بھبھوت اور یہ تیرا بیراگ
انتر میں واسنا کی جلتی ہوئی آگ
پاپی رکھی ہے پاس تیری مالا
یا کنڈلی مارے ہوئے بیٹھا ہے ناگ

انتخاب مجموعہ نمبر ۳

نو بہ نو

تیسرا ایڈیشن

نو بہ نو فلسفۂ الٰہیات پر ایک انقلابی مثنوی ہے
جس کا یہ تیسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے
یہ نظم اُردو ہی نہیں ادبِ عام میں بھی
اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ اس کا طرزِ فکر
ویدانت، تصوّف اور نوافلاطونیت سے
بالکل الگ ہے۔ اس نظم میں جو حقائق
ہیں ان کے سامنے تفکر مبہوت
ہو جاتا ہے

ازل الآزال

ہوئے لاہو کا ایک عالم تھا
لاوجود اک وجودِ مبہم تھا
بے نشاں تھے تعدّد و کثرت
سو رہی تھی دوشیزۂ وحدت
تھا عدم میں قدم قدم میں عدم
دونوں گویا بہم دگر مُدغم
ڈھونڈتا تھا ظہور کے پہلو
کلمۂ لا الٰہ الّا ہو
کتمِ لا میں تھا مطلعِ ابداع
مہرِ ایجاد تھا نہ اس کی شعاع
ازلیت کا نام تھا نہ کوئی
ابدیت کا کام تھا نہ کوئی
نہ کہیں عبد تھا نہ خوئے نیاز
نہ کہیں رب تھا اور نہ جوششِ ناز
عجز تھا اور نہ نارسائی تھی
کبر تھا اور نہ کبریائی تھی
نہ تو مرزوق تھے نہ رازق تھا
نہ کہیں خلق تھی نہ خالق تھا

حمد تھی اور نہ حامد و محمود
سجدہ تھا اور نہ ساجد و مسجود
عمل و لاعمل کا بار نہ تھا
خیر و شر جبر و اختیار نہ تھا
بے حجابی حجاب میں پنہاں
کیف عصیاں ثواب میں پنہاں
ابھی ظاہر ہوئے نہ تھے اضداد
ناشنیدہ تھے فتنہ ہائے تضاد
ایک کی ضد ہے دو یہ ہے معلوم
ہے دوئی میں تضاد کا مفہوم
خواہ یہ دو ہوں ظاہر و مفقود
خواہ یہ دو ہوں عبد اور معبود
ان میں لازم تضاد آئے گا
رُو بہ جنگ و فساد آئے گا
لا ازل جس ازل کی ہے یہ بات
وحدتِ محض تھی وہاں بالذّات
وصف و اسماء و مبتدا ابھی نہ تھا
کیسی خلقت ابھی خدا ابھی نہ تھا
صاف بالکل دلیلِ ناطق ہے
نسبتِ خلق ہی سے خالق ہے

رب کہاں کا اگر نہیں مربوب
طالبوں نے بنا دیا مطلوب
نہ چنیں و چناں نہ کیوں اور کیا
بس سمجھ لو کہ لاپتا لا در لا

●

ظہورِ وجود

ناگہاں ایک جنبشِ مبہم
ہوئی پیدا درونِ بحرِ قدم
پُرمعانی ہوا رُخِ ایجاد
رمز بننے لگا ازل کا سواد
صوت آسا ہوا سکوتِ جمود
تھرتھرانے لگے حروفِ نمود
صُوَرِ علمیہ نکھرنے لگیں
یعنی ماہیتیں اُبھرنے لگیں
رنگِ ممکن وجوب میں جھلکا
جامِ اَعیانِ ثابتہ چھلکا
قلبِ "لا" میں "نعم" ہوئی جنباں
آئینے میں نہیں کے کوندھی ہاں
تھا سنانے کو بربطِ لاہوت
ایک پُرکیف نغمۂ ناسوت
لاسبب میں ونک اُٹھے اسباب
رات میں جیسے کرمکِ شب تاب
ہوئی تحریک اک مشیّت میں
ایک جنبش ہوئی حقیقت میں

جس طرح ایک عالمِ ادہام
اُبھرے سائے کی طرح سے اجسام
مبدءِ فیض کے کھلے مخرج
گونج اُٹھی صدائے "کُن" کی گرج
جیسے خوشبو نکلتی ہے گُل سے
ایک ذرّہ الگ ہوا کُل سے

ظہورِ زماں

جزو کُل میں خلا ہوا پیدا
اور اصولاً محال تھا یہ خلا
پُر کیا ایک سیلِ لا نے اسے
بھر دیا خلطِ دا ہما نے اسے
اصل اس خلط کی سراب صفت
پھر بھی ہستی میں اپنی اصلیت
بُعدِ رابع کسی نے اس کو کہا
اور کسی نے اسے کہا ما یا
میں اسے کہتا ہوں زماں اے دل
یعنی ماضی و حال و مستقبل
اس کو پہنچے نہ رد و تصوّر کی
یہی علت ہے ہر تغیّر کی
گو بظاہر عجب سی ہے بات
حرکت موت ہے سکون حیات

●

تناسخ

ہر نفس میں ہے مرگ لا حاصل
دورِ ماضی و حال و مستقبل
حرکت کر کے مر رہا ہے ہمیش
نقطۂ پس برائے نقطۂ پیش
جستجوئے سکوں میں ہم ہیہم
کر رہے ہیں اجل کی راہ پہ رم
یہ زماں کی ہے شعبدہ بازی
مرنا جینا ہیں جھلکیاں اس کی
بیم و امید کا تماشا ہے
وقت مرتا ہے وقت جیتا ہے
موت ماضیِ نامکمّل ہے
حال کیا ہے حیاتِ مختل ہے
حال کی تشنگی سے ہے فردا
حال کا حل ہوا تو باقی کیا
اک مسلسل حیات حال ہی حال
جس کا ماضی نہ کوئی استقبال

●

ظہورِ فصلِ انا

ذرّہ جب اصل سے ہوا مہجور
اور زماں نے اُسے کیا محصور
اُس کی طبع و مزاج و خو بدلی
گلشنِ سرمدی کی بُو بدلی
وہ یہ بھولا کہ کیا ہے میری اصل
اپنے مبدے پہ کی نظر بالفصل
فصل پیدا ہوا تو دوئی اُبھری
دشمنِ امن و آشتی اُبھری
جب ہوئے دو وجود امن کہاں
ضد فسادات کی ہے رُوحِ رواں
غیر وہ ہیں ہوں میں یہ میں کیسا؟
میں یہی میں تو ہے وجود مرا
میں الگ، وہ الگ، میں جزو، وہ کُل
میں جدا، وہ جدا، میں بُو وہ گُل
میں نے کیں خلق پھر تو میں پھیر میں
سلسلہ وار میں کے اندر میں

میں

میں کے آتے ہی آ گئی آفت
چھڑ گئی جنگِ انفرادیت
پردۂ جہل کھنچ گیا آگے
دیوِ خوفِ فنا بڑھا آگے
موت جھپٹی کہ میں کو آ پکڑے
میں نے چاہا بقا کو جا پکڑے
میں مرا میں جیا ہوا پھر فوت
بالتواتر تھی زندگی اور موت
کبھی کھویا فنا کے دامن میں
کبھی اُبھرا بقا کے گلشن میں
نہ حقیقت ہے یہ فنا میں کی
واقعہ ہے نہ یہ بقا میں کی
ہے سراب ایک خود وجودِ انا
اس کی کیسی حیات اور فنا
واہمہ میں ہے جشنِ موت و حیات
غیر فانی ہے نفسِ شے بالذّات

●

ظہورِ وجودِ خدا

جب انا خوف کا شکار ہوا
سخت محزون و بے قرار ہوا
اپنا ہی وہم اسے ڈرانے لگا
ہر طرف جا کے گڑگڑانے لگا
مہر کے سامنے دعائیں کیں
ماہ و انجم سے التجائیں کیں
بحر کو آسمان کو پوجا
ہر محیّر نشان کو پوجا
خود کو لاکھوں دئیے فریب مگر
مرضِ خوف سے ملا نہ مفر
ڈریں آخر انا کو یہ سوجھی
چاہیے کوئی پاسبانِ قوی
وضع خالق کیا تفکّر میں
اک بنایا خدا تصوّر میں
ہے خدا کی یہ ہستیِ مبہم
ظنِّ انساں کا وضع کردہ صنم

آغازِ عبادات

چل دیا اس خدا کی سمت ہر ایک
خود کو دے کر فریب بن کر نیک
سیر فی اللہ کے لیے بے نیاز
سیر الی اللہ کا ہوا آغاز
علم کسبی سے بنے مذہب
جن کے نکلے نئے نئے مطلب
تجزیہ جب کرو گے تقوے کا
اس کی تہہ میں ملے گا خوفِ فنا
سارے معبد ہیں اس لیے آباد
ڈر رہے ہیں کہیں نہ ہوں برباد
سہما سہما ہوا غریب وجود
کانپ کر کہہ رہا ہے یا معبود
والہانہ عبادتیں ہیں کہیں
وحشیانہ ریاضتیں ہیں کہیں
ذہن کے مرحلے معاذ اللہ
نفس کے مشغلے معاذ اللہ

نفس

نفس کی ہے یہ خوئے ناہنجار
کرتا ہے یہ حقیقتوں سے فرار
حدّتِ ہست سہہ نہیں سکتا
حال کے ساتھ رہ نہیں سکتا
کبھی ماضی میں اس کی ہے منزل
کبھی سرگشتِ دشتِ مستقبل
کبھی چھپتا ہے عیش وعشرت میں
کبھی ہوتا ہے گم ریاضت میں
کبھی مسجد میں، مے کدے میں کبھی
بن کے صوفی مراقبے میں کبھی
کبھی سرگرم مطرب وصہبا
کبھی مشغولِ لذّت تقوا
کبھی رنگیں خرامِ عشقِ صنم
کبھی حجرہ نشینِ حبسِ دَم
سایۂ خیر ہو کہ شر کی دھوپ
اسی بہروپیئے کے ہیں سب روپ

بیدار رہو

اے سراسیمۂ بقا و فنا
اے پراگندۂ فریبِ انا
اے اسیرِ زمان و ہمِ صفت
دُور افتادۂ ربوبیّت
اے بہارِ قدم کی مست شمیم
اے گلستانِ سرمدی کی نسیم
غور کر اپنی اصلیت پر تو
تجھ میں کیسی یہ عبدیت کی بُو
جہل اور خوف میں ہے کیا آلودہ
کیا ہوئے تیرے وصف محمودہ
ایک آزاد عندلیبِ ازل
صیدِ سیرِ توہّم مہمل
دانۂ مکر و کید چھوڑ اُڑ چل
توڑ کنجِ قفس کو توڑ اُڑ چل
تا بہ کے قید و بند ناسوتی
تیرا گھر ہے فضائے لاہوتی

●

گمشدگیِ وجود

حافظے کی یہ بالتسلسل رَد
اور یہ خواہشات کی تگ و دَو
افقِ ذہن کی یہ بوجھل شام
اور تصوّر تھکا تھکا ناکام
کھوئے کھوئے ہوئے یہ خود مفقود
سہمے سہمے ہوئے تمام وجود
زیرِلب ورد ہے یہی ہر بار
"وقِنا ربّنا عذاب النار"
مذہبوں کے بڑے بڑے گٹھّر
بے محابا لدے ہوئے سر پر
جہل کی ظلمتوں میں گم منزل
زندگی اک امیدِ مستقبل
عقل ماؤف پیروی کے چلن
کسی مرشد کا ہاتھ میں دامن
سادہ لوحی کے ساتھ ارادت مند
ذہن کے مستقل دریچے بند
زہد پیشہ طبیعتہً مزدور
وعدۂ آخرت سے ہیں مسرور

ہے وہ ایمان جو شنیدہ ہے
یہ عقیدہ ہے وہ عقیدہ ہے
ہے عقیدے کی اصل یہ تعریف
سوچنے کی جہاں نہ ہو تکلیف
وسعتِ حُرّیت سے ترساں ہیں
پہن بست فضائے لرزاں ہیں
بیٹھے ہیں طائرِ شکستہ پر
بند کر کے قفس کا آپ ہی در
نہیں تابِ کلامِ آزادی
سُن نہیں سکتے نامِ آزادی

●

جہل

جہل کی وجہ جہلِ رازِ وجود
علم کی راہ جس سے ہے مسدود
متأثر زماں سے محسوسات
تابعِ جہل سارے حسّیات
ذہن و سمع و بصر غلط کارہ
درک و احساس سارے آوارہ
جہل سے ہوگیا ہے پیدا خوف
جہل سے آگیا ہے فہم میں جوف
واہمہ سے عبث اُلجھتے ہیں
سانپ رسّی کو ہم سمجھتے ہیں
جہلِ اعظم ہے وہم خوف خدا
یعنی اللہ ہم کو دے گا سزا
اس کے سجدوں میں ہو کمی نہ کہیں
وہ خفا ہوگیا تو خیر نہیں
اُس کی نت نئی طرح سماجت ہے
حمد ہے، التجا ہے، منّت ہے
دیو ہے کوئی کبریا گویا
کوئی عفریت ہے خدا گویا

احتیاج سلام کیا اس کو
چاپلوسی سے کام کیا اس کو
جس کو کہتے ہیں ربِّ نامعلوم
ہے ہمارا ہی سایۂ موہوم
ابنِ آدم کے سمجھو نفسیات
ہم نے اس کو دیے ہیں اپنے صفات
قہر ہم میں ہے اور وہ قہّار
جبر ہم میں ہے اور وہ جبّار
ہم میں حرصِ قیام، وہ قائم
ہم میں طمعِ دوام، وہ دائم
کبر ہم میں ہے، کبریا وہ ہے
اک ہمارا اگڑھا خدا وہ ہے

●

جبر و اختیار

اصل ہے اِس جہان میں کرنی
جیسی کرنی ہے ویسی ہی بھرنی
ہے عمل در عمل عمل پیدا
کل سے آج آج سے ہے کل پیدا
اک سُنا یا ہوا پیام ہیں ہم
اپنا ماضیِ ناتمام ہیں ہم
گشتِ ماضی ہیں حال و مستقبل
ما سبق سلسلوں کے ہم حاصل
جد و آباد و مورثِ اعلا
غار کی زندگی سے تا ایں جا
فکر و طرزِ معاشرت مذہب
قوم و آب و ہوا غرض یہ سب
حال و فردا کی کرتے ہیں تعمیر
شاید اس کا ہی نام ہو تقدیر

خیر و شر

راہِ ہستی ہے قدر را فہدا
خیر پھر کیسی اور شر کیسا؟
ذہن نے کچھ بنائے ہیں معیار
نیک و بد کا ہے جن پہ دار و مدار
انھی قدروں پہ جانچتا ہے بشر
یہ بھلا یہ بُرا یہ خیر یہ شر
ذہن خود ہے اسیر ورثہ جات
جس کے ناقص تعینات صفات
خیر اور شر میں فاصلہ کیا ہے
نام کے فرق کے سوا کیا ہے
ایک سے دوسرا نہیں ہے غیر
خیر شر میں ہے اور شر میں خیر
ایک نغمہ ہے اور ایک ہے لے
فی الحقیقت ہیں دونوں ایک ہی شے
آتشیں مہر اور خنک مہتاب
گرمیاں اور لکہ ہائے سحاب
آب ابیض چمن کی رنگینی
تلخیِ مے ثمر کی شیرینی

نالۂ عندلیب خندۂ گل
سوزِ نغمات سازِ قلقلِ مل
عیب کون ان میں اور ہنر ہے کون؟
خیر کون ان میں اور شر ہے کون؟
ایک مقصد ہر اک وجود کا ہے
ایک مطلب ہر اک نمود کا ہے
خیر تابِ جمالیِ فطرت
شر ہے حسنِ جلالیٔ فطرت
اپنی قدروں کا ترک کر کے خیال
دیکھو زیبائشِ جمال و جلال
حسن پہلے جلال ہوتا ہے
جس سے پیدا جمال ہوتا ہے
نارِ نمرود کی ہے اک ترمیم
صورتِ گلستانِ ابراہیم

پراگندگی

بے سکونی دوادوش ہلچل
دل پراگندہ فکرِ صیدِ خلل
رنگ و بو سے فریب خوردہ حواس
مقصدوں سے دبے ہوئے احساس
زورِ تحصیلِ مدّعا زنجیر
تیز ہر وقت ناخنِ تدبیر
ذہن سرگشتۂ خمارِ انا
رُوح آوارۂ دیارِ انا
واہمہ میں بھٹک رہے ہیں خیال
آپ اپنے لئے بنے ہیں جال
اقتصاد و سیاست و مذہب
صف بہ صف ہیں فسُون ہائے طلب
امن کے نام پر کہیں ہے فساد
عدل کے واسطے کہیں ہے جہاد
لے کے بیٹھے ہیں مشغلے مبہم
خود سے بھاگے ہیں خوف کھا کے ہم

پیروی

پیروی عقل کی ہے کوتاہی
پیروی اصل وجہِ گمراہی
پیروی ظلمتِ جہالت ہے
پیروی قید ہے حماقت ہے
پیروی سے سُن اے ارادت مند
ذہن و افکار ہوتے ہیں جد بند
تیری ندرت ہے طاقتِ تخلیق
تیری جودت ہے مشعلِ تحقیق
منت شریعت کا بوجھ ڈال اس پر
مت طریقت سے اس کو بوجھل کر
قول ہیں دوسروں کے افسانے
حق وہ ہے جس کو آپ پہچانے
سُن کے ذکر و بیانِ لذتِ قند
کوئی سمجھے گا کیا حلاوتِ قند
یوں سہی تیرا شیخ عارف ہے
رمز کون و مکاں سے واقف ہے
پھر بھی جو کچھ بتایا ہے اس نے
ہے حدیثِ دگر وہ تیرے لئے

ہے کسی کا بیاں بیان فقط
سنی باتیں ہیں داستان فقط
محض افسانہ ہے یہ دل جمعی
حق نہیں ہے حقیقت سمعی
توڑنا ہوگا خود ہی کوہِ گراں
ڈھونڈنا ہوگا خود ہی سرِّ نہاں
کوئی مرشد بتا نہیں سکتا
راستہ منزلِ حقیقت کا
کھول باغیچۂ دروں کا در
تیرا رہبر ہے خود ترے اندر
رمز کے بعد رمز نکھرے گا
راستہ تیرا آپ اُبھرے گا

•

انتخاب مجموعہ نمبر ۴

گلبن

نظمیں

دوسرا ایڈیشن

گلبن کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت
ان تمام نظموں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا
جو ہنگامی اور وقتی تھیں۔ آج دوسرے
ایڈیشن سے مزید تقریباً نصف نظمیں
نکال دی گئی ہیں۔ رد شدہ
نظمیں بدلے ہوئے حالات
سے ہم آہنگ
نہ تھیں

بمبئی

یہ دیارِ بمبئی یہ معدنِ زر زر سرشت
یہ غریبوں کا جہنم یہ امیروں کا بہشت
ایک جانب کر رہے ہیں اہلِ زر سونے کی کشت
دوسری جانب ہیں مفلس اور بارِ سنگ و خشت

جن کی محنت سے یہ رونق ہے وہی بدحال ہیں
مفت خور اہلِ جنّتِ دنیا کے مالا مال ہیں

جب نکلتا ہے سمندر سے نہا کر آفتاب
اور رخ سے لیلیِ شب کے ہٹاتا ہے نقاب
یوں دمکتے ہیں یہاں کے قصر ہائے لاجواب
جس طرح اک سنگ دل مغرور قحبہ کا شباب

ایسی قحبہ جس کا ظاہر قابلِ صد بندگی
جس کا باطن بے وفائی کج ادائی گندگی

چوڑے چوڑے راستے یہ موٹروں کی ریل پیل
یہ ٹرامیں یہ بسیں یہ تیز رَو بجلی کی ریل
کالبادیوی کرافٹ مارکٹ دادر پریل
ساری بازاریں مزیں ہر جگہ پیسے کا کھیل

اپنی دھن میں سب ہیں کوئی مڑ کے تکتا بھی نہیں
کچھ بھی ہو دل آدمیت کا دھڑکتا بھی نہیں

یہ چیخ کی آواز آئی وہ گرا اک ناتواں
وہ چلے موٹر کے پہیے کر سے بولیں ہڈیاں
ایک دم میں ہو گئی گز بھر زمیں وہ خوں چکاں
ایک بولا "اے یہ سالا بیچ میں آیا کہاں
مُردہ گاڑی آئی لاش اُٹھی تماشا ہو گیا
مہتروں نے خون دھویا صاف رستہ ہو گیا

اس جگہ کا کس قدر بے کیف ہے حسن و جمال
پاس تک آتی نہیں رنگینیٔ فکر و خیال
آدمی لاکھوں یہاں ہیں آدمیت کا ہے کال
ایسا شاید ہی کہیں آئے نظر قحطِ رجال
اس جزیرے میں گلِ انسانیت کھلتا نہیں
سب یہاں ملتا ہے لیکن آدمی ملتا نہیں

سیٹھ جی ہیں ایک اور بھوکے یہاں ہیں دس ہزار
ایک سر بالائے بالیں لاکھ سر ہیں زیرِ بار
چند ہیں دلّال مارِ گنجِ زر عشرت گسار
اتنے محنت کش کہ جن کا ہو نہیں سکتا شمار
چلتا ہے کیوں کر یہاں کا اقتصادِ زندگی
بس قیامت ہے قیامت یہ تضادِ زندگی

پُر شغب، پُر شور، پر غوغا و مہمل یہ دیار
اک مجسّم غلغلہ ہے ایک ہلچل یہ دیار
خلق و احسان و مروّت کا ہے مقتل یہ دیار
دم میں آنکھوں کا چُرا لیتا ہے کاجل یہ دیار
حکمراں اس شہر پر دلّال ہیں بازار کے
چور پھرتے ہیں یہاں جامے میں ساہوکار کے

آہ مزدوروں کی بوسیدہ گھناؤنی چالیاں
رقص کرتی ہیں جہاں پر غربتیں، بدحالیاں
خوں ملے بلغم کی دیواروں کے اوپر لالیاں
مثلِ افعی رینگتی پھرتی ہیں گندی نالیاں
دق، تپ و لرزہ یہاں پر روز و شب مہمان ہے
اور اس مہمانِ بد کا میزباں انسان ہے

گو بجتی ہے ان گھروں میں موت کی بانگِ رحیل
ختم پر ہے یاں کے انسانوں کی جینے کی سبیل
صورتیں مکروہ، میلے جسم، پوشاکیں ذلیل
زرد رنگت سوکھے سہمے جیسے برسوں سے علیل
رُوح اُن کی مر چکی ہے اور دل صد پاش ہیں
آدمی کا ہے کو گویا چلتی پھرتی لاش ہیں

●

انساں کبھی نہیں مرتا

رات کو دل پہ مسلط تھا مرے خوفِ اجل
اور میں کہتا تھا کہ کل دیوِ قضا آئے گا
پھر کوئی پا نہ سکے گا مری ہستی کا سراغ
ایک انجان اندھیرا مجھے کھا جائے گا
یوں بھلا دیگا زمانہ مجھے کچھ روز کے بعد
کوئی اشعار بھی میرے نہیں دہرائے گا

ایک ننّھا سا ستارہ مری الجھن پہ ہنسا
اور بولا کہ سُن اے بندۂ کوتاہ نظر
کوئی مرتا نہیں جو ہے وہ ہمیشہ ہوگا
موت کا خوف حقیقت میں ہے ابہامِ بصر
رات بھر دیکھ تری بزم میں میں رہتا ہوں
پردہ پڑ جاتا ہے مجھ پر مگر اک بعدِ سحر

موت اور زیست حجابوں کا ہے اٹھنا گرنا
ہو رہا ہے اسی صورت میں تسلسل یہ رہیں
موت کے بعد ہے اک زیست کا نظارۂ نو
اور پھر زیست کے بعد ایک قضا کا ہے جرس
منزلیں راہ کی آتی ہیں جسد بعد جسد
مشعلیں راہ کی جلتی ہیں نفس بعدِ نفس

بیج پھر اُس سے شجر اور شجر سے پھر بیج
دائرہ وار اسی طرح سے پھرتا ہے وجود
ہے فنا نکتۂ آغازِ حیاتِ تازہ
وہ ہے موجود کسی شکل میں جو ہے مفقود

اصل شے ایک حقیقت ہے جو لافانی ہے
اس حقیقت کے ہیں دو رنگ عدم اور نمود

آج بھی زندہ ہے وہ انجن اسٹیفنسن میں
جس نے کل بھاپ کی قوت کو کیا تھا معلوم
اوّلِ دائرہ چکر میں ہے ہر پہیے کے
شعرِ غالب میں جھلکتا ہے وکی کا مفہوم

در حقیقت یہ زماں کا ہے طلسم تغئیر
ورنہ شرمندۂ معنی نہیں لفظِ معدوم

حال ماضی کو ملا دیتا ہے مستقبل سے
حال کے ربط کو کر اپنے عمل سے مضبوط
حال میں رنگِ عمل بھر کے اُسے واضح کر
حال سے ہے ترے فردا کی وضاحت مشروط

یاد رکھ آہ کہ انساں نہیں مرتا ہے کبھی
زندگانی میں ازل اور ابد ہے مخلوط

انکشافِ حقیقت

علم اور عقل سے ظاہر ہوا بس ایک ہی راز
رائگاں عمر ہوئی اور نہ کچھ بھی جانا

زعم یہ تھا کہ مرے جام میں کھنچ آئیگی مے
لیکن اب تک ہے اسی طرح تہی پیمانہ

خود پرستی میں ہوا صرف مرا وقت عزیز
اور رونا ہے کہ اب تک نہیں خود کو جانا

سفر کرتے رہے گمرہ سفرِ ہستی میں
رہنما آپ ہی سب راہ سے تھے بےگانا

یہ بھی افسوس کہ شل ہو گئے پائے اُمید
یہ بھی احساس کہ دو گام پہ ہے مے خانہ

علمِ افلاک و زمیں پا کے بھی یہ حالت ہے
جیسے خرمن سے کوئی ایک اُٹھا لے دانا

سخت کوشش سے بھی حل ہو نہ سکا عقدۂ زیست
انگلیاں تھک گئیں سلجھا نہیں تانا بانا

دل یہ کہتا ہے کہ فی الحال میں ناکام سہی
ان دھندلکوں کی تہوں میں ہے کوئی افسانا

جیسے اک طفل سرِ ساحلِ دریائے حیات
ہے کھڑی غرقِ تحیر مری فکرِ دانا

اسپتنک

سب سے اونچے کوہ کی چوٹی پہ رکھ کر اپنے پاؤں
چیر ڈالا ابنِ آدم نے فضا کا کشتیِ راز
قیدِ امکاں کی حدیں بن کر دھواں سب اڑ گئیں
نازشِ صد کبریائی ہو گیا فرقِ نیاز

سکنائی صنعتِ انساں فلک پیما ہوئی
جاذبہ کی رہ گئی بل کھا کے زنجیرِ دراز
پرتوِ عقلِ زمیں پہنچا نواحِ ماہ تک
انجم آرا ہو گا اب بزمِ جہاں کا کارساز

آ رہا ہے فاتحِ فردائے اجرامِ فلک
اے بناتُ النعش اٹھو اور سنبھالو اپنے ساز
رشتۂ بین الکواکب زندہ و پائندہ باد
عقلِ نو تابندہ باش و عزمِ انساں زندہ باد

نئی قدریں

گُل نئے برگ نئے سبزۂ واشجار نئے
نئے جلووں سے مزیّن ہے بہارِ گلشن

ختم ہے عہدِ تعیّش کی جمودی تہذیب
باغباں دیکھ کہ کچھ اور ہوا رنگِ چمن

ذوق نے حسن کے معیار بدل ڈالے ہیں
عیب ہے اب لبِ معشوق پہ مسّی کی دھڑن

اصطلاحات وخیالات نئے اُبھرے ہیں
نئے الفاظ ہیں اشعار کا اب پیراہن

ہم کو مجہول بنائے تھی بساطِ مخمل
زندگی کے لئے درکار ہے کچھ کھُردراپن

دب گئے خاک کی اُگتی ہوئی تہذیبوں سے
آسمانوں سے وہ آئے ہوئے اقدارِ کہن

آج مرکوزِ توجہ ہے وہ سطحِ اسفل
قوتِ نامیۂ زیست کا جو ہے معدن

●

شاعر

میں ہوں شاعر کہ بیک وقت ہوں سرمست و حکیم
مست مجنون ہے اور دوسری فرزانہ
میں ہوں کولمبس سرچشمۂ نغماتِ حیات
زلفِ معنی کا مری انگلیوں میں ہے شانہ
شاعری جذبہ و حکمت کے توازن کا ہے نام
جس کے اجزا ہیں دلِ پُرجذب و سرِ فرزانہ
مست پھر ایک شرابی کے سوا کچھ بھی نہیں
نہ سمجھتا ہو اگر فلسفۂ مے خانہ
فلسفی وہ ہے فقط سوختنی ہیزم خشک
جس کا دل کیف و ترنم سے ہوا بیگانہ
میرے ناقد مجھے مستانِ قلندر نہ بنا
زیر تہذیبِ فراست ہے مرا مے خانہ

پیش رُو پیش نظر

عزم سے بنتا ہے مستقبل اقوام جہاں
عزمِ انساں کو سمجھ آج کی حالت کو نہ دیکھ
کارِ تخلیق بہاراں میں ہیں شعلے فی الحال
ساون آتا ہے بس اب جیٹھ کی حدت کو نہ دیکھ
آج کا خون ہے رنگِ گُلِ فردا کے لئے
دردِ زخمِ دلِ مجروح کی شدت کو نہ دیکھ
اشک موتی صدفِ وقت میں بن جائیں گے
ہو کے مایوس گلوگیریِ رقت کو نہ دیکھ
"پیش رو پیش نظر ہیں یہی آدابِ حیات
صبح ہونے کو ہے اب رات کی ظلمت کو نہ دیکھ

ابنِ آدم کا عزم

یہ خارزارِ جہاں صاف کر رہا ہوں میں
زمیں پر ہے بنانا مجھے خود اپنا بہشت
ترے بہشت کو ٹھکرا کے میں نکل آیا
میں آدمی ہوں اطاعت نہیں ہے میری سرشت
نہیں وہ چاہیئے جو ہاتھ اٹھا کے ملتا ہے
چمن ہو اپنا گل اپنے ہوں اور اپنی کشت
مقدّرات کی گھٹن ہے اب توضیقِ نفس
شکستہ کرنا ہے زنجیر حلقہ ہائے نوشت
میں آرہا ہوں سنبھال اپنے چاند تاروں کو
لگے گی اوجِ ثریا پہ خاکِ ارض کی خشت
نہ کر سکیں گے حکومت اب عقلِ انساں پر
محافظانِ حرم اور لعبتانِ کنشت

●

بغاوت

ظلم خو دشمنِ انصاف یہ خوں خوار سماج
جس کی ہر شے ہے بہ اندازۂ پیمانۂ زر
جس کے ہر وصف کا معیار فقط دولت ہے
چھن کے آتی ہے جہاں سونے کے پردوں سے نظر
مستحقِ عزّت و تکریم کا وہ ہوتا ہے
ڈھیر پر سونے کے بیٹھا نظر آئے جو خر
جعل سازوں کو جہاں صدر میں جا ملتی ہے
جہاں نا اہل کی پاپوش پہ جھکتے ہیں سر
خونِ مزدور چراغوں کا جہاں روغن ہے
جہاں چکّی میں دلے جاتے ہیں اربابِ ہنر
اُف یہ مکروہ حقائق کہ جو بھولیں نہ بھلائے
اُف یہ منحوس نظارے کہ جو ہیں ضیقِ نظر
ہاں میں باغی ہوں مگر میری بغاوت کو سمجھ
مجھ کو مطعون نہ کر ہمدمِ کوتاہ نظر
میری آنکھوں سے ذرا دیکھ یہ تصویر مہیب
تیرے سینے میں دھڑکتا ہے اگر قلبِ بشر

سامنے دیکھ وہ ہے ظلم کا عفریت کھڑا
جس کے ہونٹوں میں ابھی تک ہے بھرا خونِ جگر
کوڑھ کا ایسا تعفن ہے فضا میں پھیلا
ایسی بدبو ہے کہ ہو سانس کا لینا دوبھر
جسم انساں کے ہیں روندے ہوئے کچلی ہوئی روح
قبرِ بوسیدہ کے مانند ہیں رہنے کے گھر
دیر و مسجد کی وزارت ہے تو زر کی شاہی
پھانسیاں جھول رہی ہیں جدھر اُٹھ جائے نظر
آ۔ مرے دوست بغاوت کی اُٹھا کر مشعل
وقت کی اس شبِ تاریک کو کر ڈالیں سحر

میری شہناز

میری شہناز ترے عشق کی سرمستی میں
گھول کر تلخیٔ ایام میں پی جاتا تھا
پُر امیدِ رُخِ زیبائے عروسِ فردا
زندگی سوز مئے خام میں پی جاتا تھا
تیرے اعجاز نما دیدۂ میگوں کی قسم
زہر یہ لے کے ترا نام میں پی جاتا تھا

لیکن افسوس کہ اب وہ بھی سہارا نہ رہا
خواب دیکھے جو تھے میں نے وہ ہوئے بے تعبیر
دُور تجھ سے میں اکیلا سفرِ ہستی میں
تو کسی اور کی اور پاؤں میں تیرے زنجیر
نام لینا بھی ترا میرے لئے سخت گناہ
اور اُدھر ذکر مرا تیری زباں پر تقصیر

یاد ہے مجھ کو ابھی تک ترا ہنگامِ سفر
شادیانوں کا وہ غل چار طرف چیخ پکار
اک جواں مرگ کی جس طرح سے جاتی ہے لاش
یوں اٹھا کر ترے ڈولے کو چلے چار کہار
شام کی گرد میں گم ہوگیا پھر ترا جلوس
اور میں بدبخت بنا رہ گیا نقشِ دیوار

اب تو سنتا ہوں کہ بہلا لیا فطرت نے تجھے
اللہ رکھے تو ہوئی چاند سے بچوں کی ماں
ان کی معصوم مسرت تجھے مسرور کرے
یہ تمنا ہے کہ آباد رہے تیرا جہاں

زندگی میری کسی طرح گزر جائے گی
مجھ کو کافی ہے ترے عشق کی شمعِ سوزاں

جھریاں چہرے پہ بالوں میں سفیدی آئی
مسخ کر کے مجھے رخصت ہوئے ایامِ شباب
سوچتا ہوں کہ تری شکل بھی بدلی ہو گی
پُرسکوں وقتِ سحر جیسے جمالِ مہتاب

حرفِ آخر ترے نظارے کی اک حسرت ہے
ختم ہو زیست کے قصے کی یہ پارینہ کتاب

•

ایک بیاض

نظمیں

پہلا
اڈیشن

یہ غیر مطبوعہ نظمیں ایک بیاض میں درج تھیں جن کا انتخاب
پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ نظمیں غالباً ۱۹۶۱ء کے بعد
کی ہیں۔ کیوں کہ اس بیاض کی دوسری نظم
سفر ہے۔ یہ نظم قطعاً بمبئی چھوڑ کر خنگل میں
منتقل ہوتے وقت کہی گئی ہے۔ اس کے
علاوہ آہ ۲۲ سال کے بعد وطن گئے تھے۔
"میرا وطن" اسی سفر کی یادگار ہے۔ ان
نظموں کا رنگ گلبن کی نظموں
سے الگ ہے

•

رہِ ترقیِ انساں —

رہِ ترقیٔ انساں بنائی ہے میں نے
رہینِ آج کا رنگِ بہار ہے میرا
گزر کے پستیوں سے پستیوں کو پاٹا ہے
یہ خونِ سرخ سرِ سنگ رخسار ہے میرا
جہاں سے اوج کی جانب مڑے ہیں نقشِ قدم
اُسی جگہ یہ نشانِ مزار ہے میرا

پیشہ ور انقلابی —

ننگے! بھوکے! غریب! کھو کھلی چیخ
نعرۂ انقلاب رجعت رنگ
بے محبت کا دل ہے پہلو میں
جیسے سینے میں دفن تختۂ سنگ
اندروں بے ضمیر دل بودا
لفظِ بانگ دہل کے ہم آہنگ

سفر

تا افق پشت پہ ہے پیچ بہ پیچ اک رستہ
چھوڑ آیا ہوں بہت دور میں آبادی کو
دھول میں ڈوب گئے شہر کے مینار و کلس
دھو دیا ذہن سے اس جنتِ شدّادی کو
روندتا توڑتا تہذیب کے نقلی موتی
جا رہا ہوں کسی فردوس نشاں وادی کو

اکّا دکّا نکل آئے ہیں فلک پر تارے
شام آتی ہے لئے رات کی شہزادی کو

کتنا مکروہ مرا خوابِ معیشت تھا وہ
جیب کتروں سے بھرا اڑاکوؤں کی جولاں گاہ
ابنِ شیطاں کا چلن شیوۂ ابنِ آدم
دل کی بھٹّی میں بھرا بغض، حسد، کینہ، ڈاہ
مفت خوری کا مرض لوٹ کھسوٹ، استحصال
قایدِ مذہب و آئین و سیاست گمراہ
ان گلِ آغشتہ خنازیر کی دنیا سے الگ
آج ہے شاہدِ فطرت کی طرف میری نگاہ

جگمگانے لگیں تاروں کی ہزاروں شمعیں
رات ہے دوش پہ ڈالے ہوئے اک کالی شال
دھان کی گاڑیوں کے چرخ سے چوں چوں کی الاپ
گاؤں میں آگ کہیں جیسے کہ اگیا بیتال
شبنم آگیں یہ ہوائیں یہ فضا کی خنکی
ہچکیاں لیتی ہوئی دور پہ آواز شغال
دفعتہً کھیت گیا چاند نے ٹوٹا وہ طلسم
ابھرا اُمنڈ آیا پسِ کوہ سے سیلابِ جمال

آبِ زریں میں نہائے ہوئے سرمست اشجار
جن کے نیچے سے ہے جاتی مری مبہم سی ڈگر
پیرتا نور کے دریا میں چلا جاتا ہوں
مجھ کو معلوم نہیں خود بھی کہ منزل ہے کدھر
میں فراری نہیں نکلا ہوں لیے عزم بلند
میرے پیچھے ہے چہکتی ہوئی گلکارِ سحر
آج سرسبز چمن میرے خیالی ہی سہی
ان خیالوں کو حقیقت میں بنا دوں گا مگر

میرا وطن

وہی سکڑی ہوئی پایاب پرانی ندی
جس کو پنجوں میں دبوچے ہوئے اُنجھی سی سوار
وہی طغیاں زدہ پُل اور وہی بوسیدہ در
رینگتی جس میں چلی جاتی ہے پانی کی دھار
وہی سوکھا ہوا پیپل وہی شاخیں اس کی
جا بجا جس میں لٹکتے ہوئے پتے دو چار
یوں ہرے کھیت کی آغوش میں ہے یہ پیپل
جیسے سر باپ کا گودی میں لئے ایک نگار
وہی پیپے وہی شبپر وہی امرود کے باغ   ٹمٹماتا ہوا چھپر میں وہی ایک چراغ
عہدِ ماضی کی بھٹکتی ہوئی یادیں آئیں
آگیا میرا وطن ختم ہوا میرا سفر
شاید اس سمت سے گزری ہی نہیں سیلِ زماں
وہی جگہیں وہی رستے وہی سارے منظر
جھانکتے ہر در و دیوار سے آثارِ زوال
وہی ویران محلے وہی بوسیدہ کھنڈر
چپے چپے میں کبھی تھی یہاں گہما گہمی
کتنی برباد تمدن کی ہیں قبریں یہ گھر
تجھپہ اے خاکِ وطن ہو ترے شاعر کا سلام   تیری آغوش میں ہے میرے بزرگوں کا مقام

موت

موت در اصل حقیقت ہے حقیقت بھی وہ
ابدیت کے مبلّغ جسے جھٹلا نہ سکے
شاہ و علّام و حسینانِ جہاں ختم ہوئے
بھاگ کر موت کے چنگل سے کہیں جا نہ سکے

ظلمتِ "لا" میں ضیا آئی تھی بن کر ہستی
اس اُجالے کے مسافر کا پلٹنا ہے ضرور
اصل ہستی ہے اندھیرے کا سیہ فام خلا
جس میں پھیلے ہوئے ذرات کا ہٹنا ہے ضرور

پاس سے دیکھو اگر خوف کی عینک کے بغیر
موت آئے گی نظر معنیِ اسرارِ عظیم
نیست اور ہست کا سنگم ہے اسی مرکز پر
اسی نقطے پہ تجدد سے بدلتا ہے قدیم

مہر کا قرص نگل لیتی ہے جس وقت کہ رات
پیرہاں شر میلے ستاروں کی نکل آتی ہیں
کونپلیں جھانکتی ہیں شاخ کے پردوں سے تبھی
جب خزاؤں کی ڈسی پتیاں گر جاتی ہیں

انتخاب مجموعہ ۶

غزل پارے

غزلیں

پہلا ایڈیشن

غزل پارے ہی کے نام سے ایک بیاض ہے جس میں وہ ادبی غزلیں ہیں جو آہ سنہ ۳۶ء کے بعد کہی ہیں۔ اس بیاض میں پہلی ہی غزل "غزل بھر" کے عنوان سے ملتی ہے۔ جس سے خیال ہوتا ہے کہ آہ اپنی غزل کا ایک نیا باب شروع کرنے جا رہے ہیں۔ لیکن اگلے اوراق میں بیشتر متفرق اشعار اور کہیں دو چار مختصر غزلیں نظر آتی ہیں۔ آہ کہتے ہیں کہ بھرپور غزل کہنے کے لئے مجھے وقت نہ مل سکا۔

انھیں غزل پاروں کا انتخاب اگلے صفحات میں پیش کیا جائیگا۔ جو اختصار کے باوجود پُروقار ہیں آہ کی غزل پر پچھلے اوراق میں اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے

زرا اُس شوخ کی گلیوں میں چل پھر　　مجھے اے عمر کہنا ہے غزل پھر
سرِ شوریدہ پھر محشر بپا کر　　دلِ وحشی حسینوں پر مچل پھر
نگاہِ مست کے دو جام پی کر　　بہکتا، جھومتا مدہوش چل پھر
جمودِ زندگی سے تنگ ہوں میں
زمینِ آرزو کروٹ بدل پھر

•

افتاں خیزاں از خود رفتہ سارے ہی مے خوار گئے
حیرت ہے اے پینے والو وہ کیوں کر ہشیار گئے
نام بھی رکھے، گُن بھی بتائے، بڑے بڑے گنوانوں نے
اس کا پردہ بھی نہیں ہلتا کتنے آکے پُکار گئے
اچھا دل بیمار کا رکھا "اچھے" آئے عیادت کو
دو باتیں کیں وہ بھی ایسی جیسے کٹاری مار گئے
دُھن کے پکے عزم کے راسخ مرنا کھیل سمجھتے ہیں
تم نے دیکھا دیوانے کس شان سے سوئے دار گئے

•

مری خاکِ قبر یارب جو ہوا اُڑا رہی ہے
مجھے قتل گہہ سے شاید کوئی پھر پیام آیا
ترے نام کی کشش تھی کہ مرے جنوں کا جادو
سرِ راہ دیکھنے کو مجھے اژدہام آیا

نہ کسی کا خوف کھانا نہ خموش ہو کے رہنا
سرِ عام جو کہا تھا سرِ دار بھی وہ کہنا

کسی شاخ کو جھنجھوڑے کسی کنج کو جگائے
مجھے زہر لگ رہا ہے یہ ہوا کا دھیرے بہنا

کہیں زلزلہ ہے شاید یہ زمیں اُگلنے والی
کوئی کہہ رہا ہے مجھ سے کہ قدم جمائے رہنا

یہ ہیں پاؤں میں سلاسل یہ گلے میں طوقِ آہن
ترے عشق نے دیا ہے بڑا دل نواز گہنا

مری عمر جیسے گزری کوئی جی کے یوں دکھائے
ترا غم خوشی سے کھانا، ترے تیر ہنس کے سہنا

مرا شعلۂ بغاوت ہے گراں بہا امانت
مرے بعد نوجوانو تم اسے جلائے رہنا

●

نہیں کچھ احترامِ محبت — محبت خود ہے انعامِ محبت
بڑی بد بخت شرمِ راز داری — بڑا خوش بخت بدنامِ محبت
ہمیشہ داغِ دل روشن رہیگا — نہ آئیگی کبھی شامِ محبت

●

ہے عرضِ حال شکایت کی کوئی بات نہیں — میں جی رہا ہوں مگر لذتِ حیات نہیں
پلک جھپک نہ سکا خاک کا کوئی ذرہ — طلسم خانۂ حیرت ہے کائنات نہیں
بڑا حسین تھا ہر نقش دارِ فانی کا — بس عیب یہ ہے کسی چیز کو ثبات نہیں

منزل کا تجسّس کیا کرنا جو راہ ہے وہ خود منزل ہے
ساحل کی طلب جب مٹ جائے سمجھو کہ وہیں پر ساحل ہے
مر مر کے جیو، رو رو کے جیو، غم کھا کے جیو، دُکھ سہہ کے جیو
مر جانا تو دشوار نہیں ہاں جینا بے شک مشکل ہے

•

نہ آیا ہے نہ آئے گا سویرا
گیا ہے اور نہ جائیگا اندھیرا
بسائی ہے یہ بنجاروں نے بستی
نہ جانے کب اُکھڑ جائیگا ڈیرا

•

جب محضرِ اہلِ دار و رسن اے یار بنائے جائیں گے
یہ بھی غمِ محبّت کے معیار بنائے جائیں گے
اِن ٹوٹے ہوئے پیمانوں کو برباد نہ کر اے پیرِ مغاں
صہبا میں رچی اِس مٹی سے مے خوار بنائے جائیں گے

•

زندگی ہے در حقیقت انتشارِ زندگی
آنسوؤں میں مسکراتی ہے بہارِ زندگی

•

وہ بزم ختم ہوئی اب نہ آئے گا ساقی
جو پی چکے ہیں اُسی کا خمار رہنے دے

•

چمن کا ضبط نہ ربطِ گل و صبا معلوم
یہ رنگ و بو کا تماشہ ہے کیا خدا معلوم

بہک گئے وہ جو خود ناشناس بزم میں تھے
مگر نہیں تو یہ خوبی تھی اپنی جا معلوم

جہاں بھی موج لئے جا رہی ہے بہتا چل
کسے حقیقتِ رودِ حیات کیا معلوم

یہ آنسوؤں میں لکھی سرگزشت صدیوں کی
ترا مورخِ کج بیں نہ کر سکا معلوم

دیارِ زر کے نقیبوں کا شور ہونے دو
یہیں ہے خوب وہاں کی گلِ دفضا معلوم

•

اشارہ جس کا ہے گل کی طرف وہ خار ہوں میں
خزاں کی گود میں سوئی ہوئی بہار ہوں میں

فسانۂ زیست کا رنگیں ہوا معاصی سے
خدا کا شکر ہے عبدِ گناہ گار ہوں میں

•

تمام عمر رہا ہے تجسسِ معکوس
چراغ ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم اندھیروں میں

سمجھ لو خونِ شہیدانِ شب کے ہیں محضر
جو سرخیاں نظر آئیں کہیں سویروں میں

محبت کی باتیں نہ بھولیں بھلائے — بہت دیر روئے جو تم یاد آئے
ہوس مے کشانہ، نظر عاشقانہ — پیئے جائیں ہم اور کوئی پلائے
کہیں کیا کسی سے ہم ہی جانتے ہیں — جیئے ہیں کہ دن زندگی کے گنوائے
جب آئے ہو کانٹوں میں کانٹوں سے الجھو — کدھر جاؤ گے اپنا دامن بچائے

●

یہ ستارے ہیں بنجر یہاں کچھ نہیں، ہے فقط خاک یہ زندگی کی امیں
راز یہ چاند پر جا کے جب کھل گیا تو زمیں فخر سے گنگنانے لگی
ہے یہ پندارِ بگڑے ہوئے عہد کا، سر جھکے گا کسی کا نہ پیشِ جفا
ہر کلی پھول بن بن کے گلزار میں، آنکھ گلچیں کو اپنے دکھانے لگی

●

بگڑ بگڑ کے جو بنتا ہے راستا میرا
پرکھ رہا ہے کوئی شوقِ مدعا میرا
رخِ کرم پہ توجہ کا رنگ ابھر آیا
پسند آ گیا اندازِ التجا میرا
برا ہو میرے مقدر کی نارسائی کا
کہ ہاتھ ہو گیا شرمندۂ دعا میرا

●

تب بھی دوری، اب بھی دوری، دوری تھی اور دوری ہے
دوری ہی رہنے کی جب ٹھانی، جانے دو، مجبوری ہے

●

جہاں پر چیلیوں نے ڈالے ہیں جھولے　　خبر کیا ہمیں پر نکل اُٹھیں بگولے
بھلا دے زمانے نے کیا کیا دیئے ہیں　　نہ ہم تم کو بھولے نہ تم ہم کو بھولے

•

عمر بھر در طلب ایک نفس وصلِ حبیب
رُوز وہ سامنے آئیں تو تماشا ہو جائیں
بُجھ گئی شمع تو آگ اپنی جلا پروانے
عاشقوں کی ہے یہ معراج کہ شعلہ ہو جائیں

•

جو بے مثال ہے دنیا کے بے مثالوں میں
لئے چراغ کھڑا ہے مرے خیالوں میں
ہو ایک بات تو اُس کا کوئی جواب ملے
سوال چیخ رہے ہیں مرے سوالوں میں

•

کیا وہ سلوک ہو کسی کے ساتھ　　کاٹ ڈالے گئے ہوں جس کے ہاتھ
ذرہ ذرہ ہے تشنۂ رہرو　　راہ خود چل رہی ہے میرے ساتھ

•

مہتاب کھا رہا ہے مشعل　　تارے مرے انتظار میں ہیں

•

اُوس میں لت پت پھول سحر کی نرم ہوائیں مہکیں گے
دم بھر میں جاتا ہے اندھیرا صبح کے طائر چہکیں گے

•

ملوکِ جا چکے اب حُرمتِ عوام کرو
نظامِ نو ہے یہ جمہور کو سلام کرو
نمقیں ہو ساقیِ رنگیں خرام رند نمقیں
اٹھاؤ جام کسی خم پہ اژدہام کرو
محل گرائے تھے جن فتحمند ہاتھوں سے
انھی سے پست زمینوں کو اوجِ بام کرو
ابھی ہے یہ دلِ وحشی غزالِ رم خوردہ
اسے اسیرِ محبت بناؤ، رام کرو

•

تنظیم سے ہوتی نہیں ترتیبِ محبت
سب سے بڑی تہذیب ہے تہذیبِ محبت
آغازِ محبت کے مزے بن گئے نشتر
برباد مجھے کر گئی تعقیبِ محبت
نظارے شب و روز ہیں جلوے ہیں شب و روز
وقت آنے پہ خود ہوتی ہے تقریبِ محبت

•

نہ اِس کا سہارا نہ اُس کا سہارا تھرکتا بڑھا زندگانی کا دھارا

•

میں تو دیوانہ پرستار ہوں کیا ذکر مرا
تیرا اصنام بھی مبہوت تھا ایجاد کے بعد

مرے ہجر کو ملا ہے یہ مقام امتیازی
تری زلف ناپتی ہے مری رات کی درازی
یہ گھٹے گھٹے اندھیرے یہ رُندھے رُندھے سویرے
مرے کارساز دیکھی تری شانِ کارسازی

•

بہت عزیز ہیں سینے کے زخم آج سے مجھے
علاج ہو بھی تو کرنا نہیں علاج مجھے
خدا پرستوں سے لیکر خودی پرستوں تک
کہاں کہاں گئی لے کر یہ احتیاج مجھے

•

ہیں ظلم آج تو کل وقت احتساب کا ہے
سیاہ رات پہ عنوان انقلاب کا ہے

•

لائقِ غم نہیں یہ ظرف ہی اپنا ورنہ
تیرا اے نعمتِ یکتائے جہاں کیا کہنا

•

باقی اب عمر جو رہی ہے / صرفِ رہِ عشق ہو رہی ہے
لہرا کے جاگ اُٹھا ہے سبزہ / صحرا میں صبح ہو رہی ہے
کلیاں چٹکیں مہک اُٹھے پھول / تشریحِ بہار ہو رہی ہے

•

ہوا سویرا اُڑ گئے وہ آنسو مگر دلِ اب تک دھڑک رہا ہے
گھٹا برس کر نکل گئی ہے افق پہ کوندھا لپک رہا ہے
نہ جانے کس سوچ میں پڑا ہوں بجھا ہوا ہے چراغِ بالیں
فلک سے آنکھیں لڑی ہوئی ہیں پلک پہ آنسو چمک رہا ہے
سنبھالتا چل رہا ہوں خود کو رہِ محبت میں ہر قدم پر
دلِ ادب ناشناس لیکن بہک رہا ہے بھٹک رہا ہے

•

ذہنِ علیل سہہ نہ سکا بارِ عقل کو
اتنی شراب تند تھی بوتل درک گئی

•

شوقِ دیدار تو بہانا ہے — اصل میں دل پہ چوٹ کھانا ہے
آشیاں جل گیا تو اب ہر سمت — آشیانا ہی آشیانا ہے
انکی زلفوں کی دھندلی چھاؤں — نزع کا وقت کیا سہانا ہے

•

سب کھیل جگت کے چلتے ہیں دنیا کے تماشے ہوتے ہیں
نافہم جو ہیں وہ ہنستے ہیں، جو اہلِ نظر ہیں روتے ہیں
کانٹوں کی انی کو للکاریں بھر آبلے پائے رہرو کے
مدت سے پڑے تنہائی میں صحرا کے رستے سوتے ہیں
فرہاد کا شہرہ کیا کہنا مجنوں کے ہیں قصّے گھر گھر میں
ایمان سے کہنا اے ہمدم ہم سے بھی کہیں اب ہوتے ہیں

وہ دیکھنے لگے جب سے بہ التفات مجھے
حسین تر نظر آتی ہے کائنات مجھے
گھٹن ہوائیں، چمن خونچکاں، طیور خموش
کہاں پہ لے آگئی ہے گرمیٔ حیات مجھے
پگھل کے رہ گئے الفاظ رازِ گل جو کھلا
میں یوں کھڑا ہوں نہ آتی ہو جیسے بات مجھے

•

اس تجسس کے بھلاوے میں عجب بات ہوئی
ڈھونڈنے تجھ کو چلے خود سے ملاقات ہوئی

•

رقص سائے اجل کے کرتے رہے
جھلملاتا رہا چراغِ حیات

•

ایک مبہم سی کرن آس کی ہے وجہِ حیات
یہ نہ رہ جائے تو پھر زیست ہی مشکل ہو جائے

•

قہقہے تھے وقت تھا اک دوستو
اب تو رونا بھی مجھے آتا نہیں
گر گئی ساغر سے مے تو گر گئی
وقت جو جاتا ہے پھر آتا نہیں

نظر پہ ناز تھا اہلِ نظر بھی بن نہ سکے
خدا بنائے مگر خود بشر بھی بن نہ سکے
گزار دی ہے تذبذب میں زندگی افسوس
جنونِ شوق ترے نامہ بر بھی بن نہ سکے
اُٹھائے مشعلیں نکلے تھے رہ نمائی کو
ہوا ہے یہ خسِ رہگزر بھی بن نہ سکے
بجھے تو یوں کہ اُلجھتے رہے اندھیروں سے
چلے تو یوں کہ نقیبِ سحر بھی بن نہ سکے

•

مری دردآشنائی مجھے اس جگہ پہ لائی
کہ جہاں سے بن گیا ہے مرا غم غمِ زمانہ
میں بشوق کعبے جاتا میں خوشی سے سجدے کرتا
جو جبیں سے چھوٹ سکتی تری خاکِ آستانہ

•

میں قفس میں تھا چمن بھولا گیا — شاخِ گل پر آشیاں بھولا گیا
صاحبِ نام و نشاں آتے رہے — رفتہ رفتہ وقت انہیں بھولا گیا

•

بات کہنے کی نہیں جانے دے مالک میرے
ہم نہ ہوتے تو ترے دہر میں کیا رکھا تھا

•

تو جا ان سے چل لے پیکِ اجل افسانے میرے رہنے دے
کل آنے والی نسلوں سے دو باتیں مجھ کو کہنے دے

●

رہبر بھٹکے، سالک کھوئے ٹھور پتہ منزل کا نہیں
پی کے نگر کی کوئی ڈگر ہو تو اسکو ہموار کرے

●

حیات و مرگ خیالات کا سفر کہیئے
خطِ گماں کو بھلا کیسے رہگزر کہیئے

●

نس نس میں بجلیاں ہیں رگ رگ میں آندھیاں ہیں
انساں کی شکل میں ہم طوفاں بن کے آئے

●

خالی جام شگونِ بد تھا اللہ رکھے ساقی کو
دل میں جو کچھ خون تھا باقی ڈال دیا پیمانے میں

●

انتخاب

ڈاکٹر زرینہ ثانی۔ ۲۶۱۔ شنکر نگر
ناگ پور

صفدر آہ کی دوسری تصانیف

تلسی داس اور رام چرت مانس | شاعر اعظم تلسی داس اور ان کی رامائن کا اردو میں پہلا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

میرا اور میریات | خدائے سخن میر علیہ الرحمہ کی شاعری حیات اور شخصیت پر ایک مکمل تصنیف۔

ہندوستانی ڈراما | ناشر نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا۔ ڈرامے کے موضوع پر ایک بے عدیل کتاب۔

امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر | یہ عالمانہ تصنیف خسرو کی ہندی شاعری پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

فردوسی ہند | خانوادۂ انیس کے عظیم ترین رزم نگار فارغ کے ضخیم مراثی اور ان کی حیات کا جائزہ

نور نو | فلسفۂ الٰہیات پر ایک مثنوی جو دنیائے ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔

گلبن | صفدر آہ کی نظموں کا مجموعہ

زمزمہ | صفدر آہ کی رباعیوں کا مجموعہ

علمدار کربلا | اردو ادب کا سب سے بڑا رزمیہ مرثیہ از فارغ۔ مع مقدمہ صفدر آہ

پریم بانی | ڈی لکس ایڈیشن۔ میرا بائی کی حیات اور شاعری کا جائزہ

لال قلعہ | صفدر آہ کا ایک ناولٹ

مانس شبد کوش | از صفدر آہ (زیر طبع)

صفدر آہ کی پرانی تصانیف ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۶ء تک

فلسفۂ میرا | خدائے سخن میر پر پہلی تصنیف

تکمیل ہجا | اردو ہجا پر پہلی تصنیف

قومی زبان | ہندوستان کی قومی زبان کے مسئلے پر پہلی تصنیف

تعلیم بالغین | بالغین کی تعلیم کے لئے اردو میں پہلا قاعدہ

انجام محبت | ناول مصنف کی پہلی تصنیف

گناہ کی دھار | پرانے طرز پر ایک رنگین ناول

شرارے

مصنف کے افسانے پرانے انداز کے

آہ کے نو شعر

تیسرا ایڈیشن مصور

…ر آہ سیتاپوری کا شمار میں اس عہد کے صاحب نظر شاعروں میں کرتا ہوں
…ممتاز دانشور ہیں۔ زبان کا حسن، جذبات کی حرارت اور علم و دانش کی روشنی
…کی خصوصیت ہے۔ ان کا کلام عام اس لئے نہ ہو سکا کہ انھوں نے گوشہ نشینی
…ری کی ہے۔ گمنامی کے بادل اس آفتاب کی روشنی کو زیادہ دن نہ روک سکیں گے۔
…کرنوں کی طرح دلوں کی زمین پر اتریں گے اور روح کو منور کریں گے۔ زرینہ ثانی کے
قلم نے پہلی بار ان حجابات کو اٹھایا ہے۔

سردار جعفری

۲ر جنوری، سنہ ۱۹۷۹ء

جناب مجروح سلطانپوری

زندگی … راہ پر چلنا آدمی کو اتنا اکیلا تو کر ہی دیتا ہے جس کا کبھی وہ
…۔ شہر سے دور، سب سے الگ تھلگ، مگر اس طرح کہ
…ہوں کو تو وہ نظر بھی نہ آئیں۔ یہ ہیں ہمارے بزرگ اور
…ر رفیق ڈاکٹر صفدر آہ، کمال انسان و انسانیت کے عشق
…شہ دانشور اور … …ت شاعر۔ فکر کی مشعل ہاتھ میں لئے بغیر ایک گام بھی نہ چلنا
ان کا مقصود فن بھی ہے اور مفہوم حیات بھی۔ اردو نظم و غزل بالخصوص رباعی کے میدان
میں ان سے نظر بچا کر گزر جانا ایک صاحب نظر کے لئے آسان نہیں ہے۔

مجروح سلطانپوری

۲۲ر جنوری، سنہ ۱۹۷۹ء

جناب خواجہ احمد عباس

ڈاکٹر صفدر آہ اردو زبان و ادب کے ایک عجوبہ ہیں۔
شاعر ہیں۔ صوفی ہیں۔ عالم ہیں۔ اردو کے، ہندی کے، اودھی کے۔ سنسکرت بھی
جانتے ہیں۔ تلسی، میرا اور کبیر پر ان کی تحقیق بے مثال ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دریائے بے پایاں
کو کیسے اور کس کوزے میں بند کیا جائے؟ ۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان کی
ہمت اور عزم کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کوئی مضمون ہو کوئی موضوع ہو آہ صاحب اس پر حاوی ہیں۔ رشک آتا ہے ان کی ہمہ دانی
پر۔ پچھتر برس کی عمر میں نوجوانوں کا ایسا جوش رکھتے ہیں۔ ان کے ذہن کی کھڑکیاں ہر نئے علم و ادراک
کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔

اگر کسی اور ملک میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کو انسائیکلو پیڈسٹ کہا جاتا۔ ہندوستان میں
جنم لیا ہے جہاں انسان کی قدر و قیمت روپے اور اوپری عزت سے ہوتی ہے۔ تب بھی غنیمت ہے کہ
آہ آج ہم میں ہیں۔ کاش! ہم کہہ سکیں کہ ہم بھی آہ میں ہیں۔

۲۳ر جنوری، سنہ ۱۹۷۹ء

خواجہ احمد عباس